۷۸۶
۱۱۰-۹۲
یا صاحب الزماں ادرکنی

Knowledge for All
SABIL-E-SAKINA

لبیک یا حُسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

www.ziaraat.com

SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

درسِ اخلاق

نام کتاب — درس اخلاق

تالیف — آیت اللہ دستغیب

ترجمہ — اسد علی شجاعتی

کمپوزنگ — کمپیکٹ سروسز

سال اشاعت — ۱۹۹۸ء

مطبع — اے، بی، سی آفسیٹ پریس، دہلی

سرورق — عباس حسنین

ناشر — عباسؑ بک ایجنسی، رستم نگر، لکھنؤ

ہدیہ — چالیس روپئے

ملنے کا پتہ:

عباسؑ بک ایجنسی

درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ

فون: — 269598، 260756

فیکس: — (0522) 260923

فہرست —— درس اخلاق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **بعثت لا تمم مکارم الاخلاق** یعنی "میں اس لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ اچھے اخلاق کی عمارت کو مکمل کروں۔"

انسان کی گفتگو اور اس کا کردار ہمیشہ اس کے علم، عقیدے اور اس کی ذاتی صلاحیت کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ آدمی جب کبھی کوئی کام اپنے اختیار سے کرتا ہے تو خود اس کام کا خیال رکھتا ہے۔ اس کا فائدہ اس کی نظر میں ہوتا ہے اور اس کا شوق اس میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو پیاس لگتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پانی اس کے قریب موجود ہے۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ پانی پینے سے اس کی پیاس بجھ جائے گی۔ لہٰذا وہ شخص پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور اسے اٹھا کر پی لیتا ہے۔ یہ عمل جب بھی ارادے اور اختیار سے انجام پاتا ہے تو یقیناً وہ علم ہی کی وجہ سے یعنی اس کام کے خیال اس کے فائدے پر نظر اور اس کے شوق ہی کی وجہ سے انجام پاتا ہے۔

اس بات کی وضاحت کرنے کے لئے کہ انسان کی اندرونی صلاحیت اس کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہے ایک اور مثال پیش کئے دیتا ہوں۔ کنجوس آدمی کو اگر معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص ضرورت مند ہے تب بھی وہ اس کی مدد کرنے کے بارے میں سوچتا تک نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایک سخی آدمی جونہی کسی ضرورت مند سے ملتا ہے فوراً اس پر اپنا لطف و کرم شروع کر دیتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ سخی آدمی کی اندرونی صلاحیت اسے نیکی کی طرف ابھارتی ہے۔

یہ تو واضح امور ہیں جو روز مرہ زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی

مقدس شریعت نے صحیح عقائد حاصل کرنے اور اپنے اندر اعلیٰ اخلاق و صفات پیدا کرنے کے سلسلے میں خصوصی حکم دیا ہے۔ اسلام نے اچھی صفات اپنانے کا حکم اس لئے دیا ہے تاکہ انسان اچھی صلاحیتوں کا مالک بن جائے اور اس میں نیکیاں انجام دینے کا ملکہ اور استعداد پیدا ہو جائے۔ اور پھر اس ملکہ، معرفت اور علم کی بدولت انسان اچھے اور پسندیدہ کاموں کو انجام دینے لگے۔

ائمہ طاہرین علیہم السلام سے منقول متعدد روایتوں میں پسندیدہ اخلاق کو انبیائے کرامؑ کا حصہ قرار دیا گیا ہے اور اسے عطیہ الٰہی بتایا گیا ہے۔ نیز ائمہ علیہم السلام نے لوگوں کو پسندیدہ اخلاق اپنانے کی طرف راغب کیا ہے اور تاکید فرمائی ہے کہ وہ اخلاق حسنہ سے غافل نہ رہیں۔ (اس سلسلے میں تین احادیث اصول کافی کی تیسری جلد کے صفحہ ۹۵ پر موجود ہیں۔)

آنحضرتؐ اعلیٰ ترین اخلاق کے درجے پر

انبیائے کرام علیہم السلام انسان کی تعمیر و ترقی کا ضابطہ حیات لے کر آئے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و تربیت خود پروردگار عالم نے فرمائی ہے اور انہیں حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کے نفوس کو برائی سے پاک کریں۔ خاص طور پر خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم درسگاہ خداوندی کے تربیت یافتہ ہیں۔ آپؐ کے لئے ارشاد رب العزت ہے۔ **و علمک مالم تکن تعلم** (سورۂ نساء ۴ آیت ۱۱۳) "یعنی جو باتیں تم نہیں جانتے تھے تمہیں سکھا دیں"۔ آپؐ ہی کے لئے خداوند عالم نے فرمایا ہے۔ **و وجدک عائلا فاغنی** (سورۂ ضحیٰ ۹۳ آیت ۸) یعنی "ہم نے تم کو تنگدست دیکھ کر غنی کر دیا"۔ مراد یہ ہے کہ اے رسولؐ ہم نے تمہیں پسندیدہ اخلاق سے مالامال کر دیا ہے تاکہ ملت مسلمہ جو تمہارے اہل و عیال کی مانند ہے قیامت تک فائدہ اٹھاتی رہے۔ اور آپؐ ہی کے بلند اخلاق کا تذکرہ خدائے ذوالجلال والاکرام نے کچھ یوں فرمایا ہے۔ **و انک لعلی خلق عظیم** (سورۂ قلم ۶۸ آیت ۴) یعنی "بے شک تم اخلاق کے

بڑے اعلیٰ درجے پر فائز ہو"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز کرنے کے بعد خداوند عالم نے آپؐ کو لوگوں کے نفوس پاک و پاکیزہ کرنے کی اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سونپی۔ ارشاد خداوندی ہے کہ **یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمتہ** (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۶۴) یعنی "رسول لوگوں کے نفوس کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب خدا اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے"۔

رسول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی تربیت پروردگار عالم کی جانب سے ہوئی، اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کچھ یوں فرماتے ہیں: **لقد قرن اللہ بہ من لدن کان فطیما اعظم ملک من ملائکتہ یسلک بہ طریق المکارم و محاسن اخلاق العالم لیلہ و نہارہ** (سفینتہ البحار جلد ا لغت خلق) یعنی "شیر خواری کے زمانے کے بعد خدائے تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے فرشتے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ساتھ ساتھ رہنے پر مامور کر دیا تھا۔ اس کا فرض یہ تھا کہ وہ خدا کی جانب سے اچھے طور طریقوں اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم رات دن انہیں فراہم کرتا رہے"۔

اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم خدائے تعالیٰ سے دعا کرتے رہتے تھے کہ وہ حسن اخلاق کی تعلیم دیتا رہے اور برے اخلاق سے بچاتا رہے۔ سفینتہ البحار جلد اول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی دعا کے الفاظ کچھ یوں نقل ہیں: **اللھم حسن خلقی و خلقی** "خدایا، مجھے ظاہری طور پر بھی اچھا بنا اور میری سیرت بھی بہتر کر دے"۔ **اللھم جنبنی منکرات الاخلاق** "خدایا، مجھے بداخلاقی کے کاموں سے دور رکھ"۔

ارشاد خداوندی ہے کہ

بل اللہ یزکی من یشاء (سورۂ نساء ۴ آیت ۴۹) یعنی "خدا جس کا چاہتا ہے اس کا نفس پاکیزہ بنا دیتا ہے"۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نفس اور روح کو

پاکیزہ بنانے والا اور پاکیزہ رکھنے والا خدا ہی ہے۔ خدا ہی تزکیہ نفس کی توفیق دیتا ہے۔ اور تزکیہ نفس کی توفیق احکام شریعت پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر انسان اپنی ذات کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ اپنی ذات کی اصلاح سے پہلے اس کا مزاج سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ اپنی خوبیوں اور خامیوں کو نظر میں رکھنا اصلاح کے لئے بہت ضروری ہے۔ محض نظر میں رکھنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آدمی اپنی اصلاح کا طریقہ بھی جانتا ہو۔ اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ آدمی اپنے بارے میں ایسی باتیں بہت کم جانتا ہے۔ **وما او تمتم من العلم الا قلیلا** یعنی "تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔"

ایک اور بات یہ ہے کہ

انسان فطری طور پر بچپن ہی سے مادی چیزوں کا مشتاق ہوتا ہے۔ ان سے انس رکھتا ہے۔ مثلاً دودھ اور کھلونے سے پہلے مانوس ہوتا ہے۔ پھر مال و دولت اور مادی آسائشوں کی طرف اس کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ خود پرستی اور اپنی ذات کا خیال رکھنے کی بھی فکر ابھرتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ چھوٹا بچہ اپنی پسندیدہ غذا حاصل کرنے اور دلچسپ کھلونے ہاتھ میں لینے کے لئے جب وہ اس کے سامنے ہو، کتنا بے چین ہو جاتا ہے۔ وہ چیز اسے نہ دی جائے تو کتنی بے تابی کا مظاہرہ کرتا ہے: **و من یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون** (سورۂ حشر ۵۹ آیت ۹) یعنی "جو لوگ اپنے نفس کی حرص سے بچالئے گئے تو ایسے ہی لوگ اپنی دلی مرادیں پائیں گے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا نفس حریص اور لالچی واقع ہوا ہے۔ کوئی شخص حرص اور لالچ کی اس صفت پر اعتدال کی حد میں قابو پالیتا ہے تو وہ اخلاق کے کمالات حاصل کر لیتا ہے۔ البتہ اس کے لئے جی پر جبر کرنا پڑتا ہے اور نفس کو

کچل دینا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔

تعلیم سے پہلے

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے کہ **یزکیھم و یعلمھم الکتاب و الحکمۃ** (آیت ۱۶۴) "رسول ان کے نفس کو پاکیزہ کرتا ہے اور پھر انہیں کتاب خدا اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے"۔

سورۂ جمعہ میں بھی — یہی الفاظ اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہیں۔ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم سے پہلے نفس کا تزکیہ ہونا ضروری ہے۔ پودا لگانے سے پہلے زمین کو ہموار اور نرم کرنا اور پھر پانی اور کھاد ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ پودے کو پھوٹنے اور نشوونما پانے کا موقع نہیں ملتا۔ انبیاء کرام علیہ السلام کا، تمام انبیاء علیہما السلام کا یہی طریقہ رہا ہے۔ پہلے وہ عملی طور پر لوگوں کو اس قابل بناتے رہے ہیں کہ ہدایت کی اصل باتیں قبول کر سکیں۔ پھر کہیں جا کر انبیاء علیہم السلام اصل عقائد اور ہدایت کی باتیں بیان فرماتے رہے ہیں۔ بغیر تربیت کے تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی سدھرنے اور سنورنے کے بجائے مزید بگڑ جاتا ہے۔ اور دوسروں کے لئے بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ ایسا شخص بلعم باعور کی طرح ہوتا ہے۔ وہ ایک بے عمل اور بدکردار عالم تھا۔ قرآن میں اسے کتے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے: **فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث** (سورۂ اعراف ۷ آیت ۱۷۶) یعنی "وہ اس کتے کی طرح ہے کہ اگر اس کو دھتکار دو تو بھی زبان نکالے رہے اور اگر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے"۔ بغیر تربیت کے تعلیم پا جانے والے لوگ ایسے گدھے کی طرح ہوتے ہیں جن پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔ ارشاد ہے **کمثل الحمار یحمل اسفارا** (سورۂ جمعہ ۶۲: آیت ۵) "ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں"۔

اچھے اور برے اخلاق

اخلاق اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ نفس کے تزکئے کی خاطر اور روح کو آلودگی سے محفوظ رکھنے کے لئے اچھے اخلاق اپنانا ہوتا ہے۔ البتہ اچھے اخلاق اپنانے کے ساتھ ساتھ برے اخلاق چھوڑ دینے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں پر بیک وقت نظر رکھنے سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔

جو شخص تزکیہ نفس کرنا چاہتا ہو' اپنی روح کو پاکیزہ کرنا اور آراستہ بنانا چاہتا ہو تو اس کے لئے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلا بھلے برے کی تمیز کا ہے۔ یہ پہچاننے کا مرحلہ ہے کہ اچھے اخلاق کیا ہوتے ہیں اور برے اخلاق کیسی صفات یا حرکات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جب آدمی علمی لحاظ سے پہچاننے لگتا ہے تب عمل کا مرحلہ آتا ہے عملی مرحلے میں وہ اپنے اندر موجود برے اخلاق چھوڑ دینے کی فکر کرتا ہے اور اچھے اخلاق اپنانے کی دھن میں لگ جاتا ہے۔ اس کے لئے بہترین طریقہ اخلاق کے عظیم ترین معلم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کے اقوال کا مطالعہ ہے۔

نفس اور روح کو پاکیزہ بنانے کی کوشش کرنا ہمارا کام ہے اور ہماری کوشش کو کامیاب بنانا خدا کے اختیار میں ہے۔ پس اخلاقی کمالات حاصل کرنے کے لئے علم و عمل کی راہوں سے کوشش بھی کرنا چاہئے اور خدائے تعالیٰ سے دعا بھی مانگنی چاہئے کہ وہ ہمیں اخلاقی کمالات سے آراستہ کردے۔

اصول کافی کے باب اخلاق میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ قول موجود ہے کہ: "جس شخص میں اعلیٰ صفات اور فضائل ہیں اسے چاہئے کہ وہ خدا کا شکر ادا کرے۔ اور جس شخص میں نہیں ہیں اسے چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں خدا سے دعا کرے"۔

آیت اللہ دستغیب اور درس اخلاق

آیت اللہ دستغیب دینی طلبہ کے تزکیہ نفس پر بہت زور دیتے تھے۔ ہر جمعرات کو درس اخلاق دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ آپ دینی طلبہ ہیں اور آپ کو اخلاق اسلامی کا نمونہ بن کر رہنا چاہئے۔ آپ جتنے زیادہ تہذیب یافتہ ہوں گے اتنا ہی زیادہ معاشرے کو مہذب بنا سکیں گے۔ لوگوں کو زبانی ہدایت دینے سے پہلے اپنے عمل اور اپنے اخلاق کے ذریعے ہدایت دیجئے اور عملی طور پر اسلامی اخلاق سے انہیں آشنا کیجئے۔

جب امام خمینیؒ نے دینی طلبہ اور یونیورسٹی یا کالج کے طلبہ کے درمیان اتحاد پر زور دیا تو آیت اللہ دستغیب نے یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ سے درخواست کی کہ وہ بھی ان کے درس اخلاق میں شریک ہوں۔ یہ درس اخلاق شیراز کے "مدرسہ حسینیہ قوام" میں ہر جمعرات کو ہوا کرتے تھے۔ آیت اللہ دستغیب' آیت اللہ خمینیؒ کے منشا کو اور ان کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کافی اہتمام کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلباء و طالبات کی کثیر تعداد نے ان کے درس میں شرکت شروع کردی۔

پھر درس اخلاق کو قلمبند کرنے اور محفوظ کرلینے کا اہتمام ہوا۔ بیچ میں کچھ درس کسی نہ کسی وجہ سے تعطّل کا شکار ہوگئے پھر بھی جو درس اب تک جمع ہو سکے وہ پیش خدمت ہیں۔ سال جاری میں بھی آیت اللہ شہید کا ارادہ تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہے لیکن خدائے تعالیٰ نے انہیں شہادت کا درجہ دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ خدا سے بے خبر منافقوں کو خدا سمجھے۔

خدا کو سمجھنے سے پہلے خود کو سمجھنا ضروری ہے

خدا شناسی سے پہلے خود شناسی ضروری ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ انسان کسی دوسرے جہاں میں رہنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور اس کا اہتمام

کرنے کے لئے اس جہاں میں بھیجا گیا ہے۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ آدمی اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے۔ پھر اس معرفت کی باری آتی ہے کہ آدمی کا خالق کون ہے اور اس نے آدمی سے کیا چاہا ہے۔

بُرے اخلاق سے پرہیز

اس موضوع پر زور دینے کے لئے آیت اللہ دستغیب نفس کے تزکیے پر زور دیتے ہیں اچھے اخلاق اپنانے اور برے اخلاق سے پرہیز کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ برے اخلاق مثلاً تکبّر، حِرص، بُخل اور حب دنیا کے خلاف بیان فرماتے ہیں۔ پھر جب غضب یا غصے کا ذکر چھڑتا ہے تو بتاتے ہیں کہ ایک غصہ رحمانی ہے اور ایک غصہ شیطانی ہے۔ کبھی یہ بیان فرماتے ہیں کہ ہر چیز درمیانی اچھی ہوتی ہے۔ اعتدال کی راہ بہترین راہ ہے۔ حد سے کم بھی کوئی چیز نہیں ہونی چاہئے اور کسی چیز کو حد سے بڑھنا بھی نہیں چاہئے۔

خدا کا شکر ہے کہ کئی برس پہلے علم اخلاق پر مبنی آیت اللہ دستغیب کی ایک کتاب "قلبِ سلیم" منظرعام پر آچکی ہے اور اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

مُطالعہ ہو تو عمل کی خاطر ہو

کسی بھی اخلاقی کتاب کا محض مطالعہ کرلینا کافی نہیں ہے۔ یہ تو تزکیہ نفس کا پہلا مرحلہ ہے جو دوسرے مرحلے یعنی عمل کے بغیر ناقص ہے۔ جو لوگ مطالعے کے بعد جان لیتے ہیں کہ اچھے اخلاق کیا ہیں اور برے اخلاق کیا ہیں تو ان پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اگر ایسی صورت میں وہ عمل نہیں کرتے ہیں تو خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ خدا ان سے پوچھ سکتا ہے کہ تم نے فلاں برے اخلاق ترک کیوں نہ کیے؟

برے اخلاق ترک کرنے کے آسان اور مناسب طریقے اس کتاب میں

بھی بیان ہوئے ہیں اور کتاب "قلب سلیم" میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔

استاد کا حق

استاد کا حق بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں بھی اور اس کے دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی۔ آیت اللہ دستغیب ہمیں درس اخلاق دیا کرتے تھے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ دونوں زمانوں میں ان کا حق یہ ہے کہ ہم ان کے کہے پر عمل کریں اور خود کو س[illegible]ار کر بتادیں۔ البتہ کمالات کی کوئی انتہا نہیں ہے اور کسی کمال کی اعلیٰ ترین منزل بھی ہم نہیں جانتے۔ پس آیت اللہ کا یہ حق ادا تو نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اپنی حد تک کوشش تو کر سکتے ہیں۔
آیت اللہ دستغیب اپنی کتاب "داستانھای شگفت" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:
"میں نے یہ داستانیں لکھی ہیں تاکہ اگر کسی کو ان سے عبرت حاصل ہو اور وہ اپنی اصلاح کرلے تو مجھے دعائے خیر میں یاد رکھے"۔ پس کم از کم ہم ان کو دعائے خیر میں تو یاد رکھ سکتے ہیں۔

اِظہار تشکّر

آخر میں ان تمام لوگوں کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے یہ کتاب چھپوانے میں مدد کی۔ ان کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے درس کے کیسٹ ہمارے حوالے کیے یا جنہوں نے درس ٹیپ کیے۔ اسی طرح میں طباعت کے شعبے سے متعلق افراد کا بھی متشکر ہوں۔ خدا ان سب کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

سید محمد ہاشم دستغیب

شیراز۔ ماہ مارچ ۱۹۸۳ء

پہلا درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کہیں رکاوٹ پھر نہ آجائے

جس طرح کہ امام خمینیؒ نے فرمایا ہے اہم اہم باتیں بار بار بتانے کے قابل ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اسی لئے اہم اہم باتیں بار بار تکرار ہوئی ہیں۔ ہم سب کو چاہئے کہ امام خمینیؒ کے احکامات کی پابندی کریں۔ ان کو معمولی نہ سمجھیں۔ وہ بہت سی مصلحتیں دیکھ اور موقع محل دیکھا کر بات کرتے تھے۔ حال ہی میں یونیورسٹیوں، کالجوں کے طلبہ اور دینی طلبہ کے درمیان اتحاد کا دن منایا گیا۔ روز وحدت منایا گیا۔ اس دن کی مناسبت سے امام خمینیؒ نے فرمایا ہے کہ اس انقلاب کے ذریعے آپ نے رضا خان اور اس کے بیٹے (محمد رضا پہلوی) کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔ ان کی کوشش تھی کہ یونیورسٹی کے طلبہ دینی طلبہ سے کٹ کر رہیں اور ان دونوں کے درمیان بیگانگی اور اجنبیت کی ایک دیوار بنی رہے۔ اس انقلاب کے ذریعے آپ نے وہ رکاوٹ ہٹا دی ہے۔ اب آپ دو ایسی طاقتیں ہیں جو باہم شیر و شکر ہیں۔ اب آپ ڈٹ کر سامراج کا سامنا بھی کر سکتے ہیں اور اس کی سازشوں کو ایک ایک کر کے ناکام بنا سکتے ہیں۔ خیال رکھئے اجنبیت کی وہ رکاوٹ آپ دونوں طاقتوں کے درمیان حائل نہ ہو جائے۔

ہم ایک دوسرے سے جدا کیوں ہوں؟

یونیورسٹی کے طلبہ اور میڈیکل کالج کے طلبہ جس طرح خدمت خلق کرتے ہیں اسی طرح دینی مدارس کے طلبہ بھی لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ایک طالب علم انجینئر بن کر قوم کی خدمت کرتا ہے، تو ایک طالب علم مولوی

بن کر قوم کی خدمت کرتا ہے۔ بس شعبے مختلف ہیں لیکن مقصد ایک ہے۔ ہر
کوئی اپنے شعبے کا ماہر ہے۔ اگر دنیوی علوم کے کسی شعبے میں کوئی ماہر ہو تو اسے
اسپیشلسٹ کہتے ہیں۔ اسی طرح دینی علوم کا بھی ایک شعبہ ہے جس کے ماہر کو
مجتہد کہتے ہیں۔ ڈاکٹرز اگر بدنی امراض کے علاج میں ماہر ہوتا ہے تو مجتہد روحانی
امراض کے علاج میں ماہر ہوتا ہے۔ جس طرح بدن یا جسم بیمار ہوتا ہے اسی
طرح نفس یا روح کو بھی بیماریاں لاحق ہوجاتی ہیں۔ پس جس طرح جسمانی علاج
کے لئے ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی علاج کے لئے مجتہد سے
رجوع کرنا ضروری ہے۔ سب خدمت خلق کر رہے ہیں اور سب کا مقصد ایک
اور نیک ہے۔ جب ایسی بات ہے تو ہم ایک دوسرے سے جدا کیوں ہوں؟

ایک نااہل ڈاکٹر

چونکہ امام خمینیؒ کا فرمان ہے اس لئے اتنا تو ہو کہ ہم ہفتے میں ایک دن اس
جگہ جمع ہوں۔ اس طرح دینی اور دنیوی علوم کے طلبہ کے درمیان اجنبیت کی
رکاوٹ دور ہو جائے گی اور پھر سے آنے نہ پائے گی۔ اس فرمان میں امام خمینی
کا ایک اور مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیوی علوم کے طلبہ کو اسلامی
اخلاق اور اسلامی تہذیب سے روشناس کرایا جائے۔ اگر یونیورسٹی کے طلبہ
مہذب نہ ہوں تو اس کا نقصان ایک عام غیر مہذب آدمی کی نسبت زیادہ ہے۔
معاشرے پر پڑھے لکھے آدمی کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹر کی طرف
بہت سے لوگ متوجہ ہوتے ہیں۔ اگر وہی بد تہذیب ہو اور اخلاقی اصولوں سے
نا آشنا ہو تو وہ ایک عام بد تہذیب آدمی کی نسبت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا
ہے۔ پہلوی (شاہ ایران) کے زمانے میں ڈاکٹر احمدی ایسا ہی ایک شخص تھا جو
شاہ کے مخالفوں کو ایک ہی انجکشن لگا کر قتل کر دیا کرتا تھا۔

البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص دینی علوم میں ماہر لیکن اخلاقی
اصولوں سے کج روی اختیار کرتا ہو۔ دین کا علم رکھنے والا ایسا شخص بھی ——

معاشرے کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ آقائے نوری جیسے مجاہد کو
سزائے موت دینے کا فتویٰ زنجان کے رہنے والے ایک مجتہد ہی نے تو دیا تھا۔

تعلیم بھی اور تربیت بھی

پس تعلیم کے ساتھ نفس کی تربیت بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر یا مولوی بننے
کے ساتھ ساتھ آدمی بننا بھی ضروری ہے۔ پیغمبروں کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ
تعلیم سے پہلے اور تعلیم سے زیادہ تربیت کو اہمیت دیتے رہے ہیں۔ **ویزکیھم
ویعلمھم الکتاب والحکمۃ** (سورہ جمعہ ۶۲: آیت ۲) "اور رسول ان کا تزکیہ
نفس کرتا ہے کتاب خدا اور حکمت کی انہیں تعلیم دیتا ہے"۔ اگر ایسا نہ ہو اور
بس تعلیم ہی تعلیم ہو تو آدمی اس گدھے کی مانند ہوتا ہے جس کی پشت پر کتابیں
لاد دی گئی ہوں۔ **کمثل الحمار یحمل اسفارا** (سورہ جمعہ ۶۲: آیت ۵) یعنی
"ایسا آدمی اس گدھے کی طرح ہے جو بڑی بڑی کتابیں اٹھائے ہوئے ہو"۔
بلعم باعور ایک ایسا ہی پڑھا لکھا گدھا تھا۔ اتنے زیادہ علم کے باوجود وہ حضرت
موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کے خلاف لڑنے والوں کا ساتھ دے رہا
تھا۔ جھوٹا دعویٰ کر رہا تھا کہ میں علمی لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام پر برتری رکھتا
ہوں۔ قرآن مجید میں بلعم باعور کو کتے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ **فمثلہ کمثل
الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث** (سورہ اعراف ۷ آیت ۱۷۶) یعنی
"وہ اس کتے کی مانند ہے کہ اگر اس کو دھتکارو تو بھی زبان نکالے رہے اور اس
کو چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے"۔

مختصر یہ کہ تعلیم سے زیادہ اپنی اصلاح اور تزکیہ نفس کی طرف توجہ دینا
چاہئے۔ یہ کام خواہشات کو دبائے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے کچھ
ریاضت درکار ہے۔ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد موجود
ہے کہ **و انما ھی نفسی اروضھا لتاتی بھا منتہ مطمئنتہ یوم القیمتہ** "یہ
میرا نفس ہے جس پر میں ریاضت کرتا ہوں۔ اور یہ میری ریاضت ہے جس کے

سبب سے میرا نفس قیامت کے دن امن و امان میں ہو گا اور مطمئن ہو گا"۔

غور و فکر پہلا قدم ہے

نفس کو مہار کرنے کے لئے کچھ تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ آسانی سے نفس قابو میں نہیں آتا ہے۔ تہذیب حاصل کرنے کی راہ یہی ہے کہ آدمی غور و فکر کرے، علم حاصل کرے، اور اسی پر عمل کرے۔ غور و فکر کی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن مجید اس پر بہت زور دیتا ہے۔ بارہا غور و فکر کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مثلاً یہ غور کرنے کے لئے کہا گیا ہے کہ آدمی پہلے اپنی ذات پر غور کرے۔ یہ دیکھے کہ وہ پہلے کیا تھا اور بعد میں کیا ہو جائے گا۔ یہ دیکھے کہ آج وہ کس حالت میں ہے اور کل اس کا کیا حال ہو گا۔ یہ سوچے کہ کہاں سے آیا ہے، کس لئے آیا ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔

اپنی اصلیت کے بارے میں غور و فکر

ہم سب نجس پانی کا ایک ایک قطرہ ہی تو تھے۔ خداوند تعالی حکم دیتا ہے کہ **فلینظر الانسان مم خلق خلق من ماء دافق تخرج من بین الصلب و الترائب** (سورۂ طارق ۸۶: آیت ۵، ۶، ۷) یعنی "انسان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے۔ وہ اچھلتے ہوئے پانی (منی) سے پیدا ہوا ہے جو پشت اور سینے کی ہڈیوں کے بیچ میں سے نکلتا ہے"۔ ایسی فکر کا بہت فائدہ ہے۔ اگر انسان یہ بھی دیکھے کہ اس کا بدن کتنا عجیب و غریب بنا ہے حالانکہ وہ پہلے ایک قطرہ تھا تو اسے قدرت خدا کے سامنے اپنا دل بھی جھکتا ہوا نظر آئے گا بدن کیا ہے پورا ایک کارخانہ ہے۔ بلکہ بدن کا ہر ہر عضو ایک کارخانہ ہے۔ دل صاف خون اور فاسد خون کو الگ کرتا رہتا ہے۔ جگر کے بھی کئی کام ہیں۔ انسان کے بدن میں رگوں کا ایک باقاعدہ جال بچھا ہوا ہے۔ اور خون ہر وقت ان رگوں میں دوڑتا رہتا ہے۔ ہر ہر عضو ایسا ہے کہ اس پر غور کرنے سے حیرت میں

اضافہ ہی ہوتا ہے۔ آنکھ کان ناک سے لے کر اندرونی اعضاء تک ہر ہر عضو قدرت خدا کا ایک شاہکار نظر آتا ہے۔

ایک بڑا مصوّر کہتا ہے کہ اچھی تصویر بنانے کے لئے ایسی جگہ ضروری ہے جو ہلتی جلتی نہ ہو۔ کاغذ ایسی جگہ پر ہو جس کے نیچے کی سطح ہموار ہو۔ کاغذ پر بھی روشنی پڑ رہی ہو اور جس چیز کی تصویر بنانی ہے وہ بھی روشن جگہ پر ہو۔ ایک کاغذی تصویر بنانے کے لئے ایسی متعدد شرطیں ہیں۔ اب قدرت خدا دیکھئے کہ اس نے ایک قطرے سے ایک مجسم انسان بنا ڈالا اور وہ بھی تاریکی کے تین پردوں کے اندر تشکیل کا یہ عمل ہوا۔ ایک پردہ تو پیٹ ہی ہے۔ دوسرا پردہ بچہ دانی ہے۔ اور تیسرا پردہ بچہ دانی کے اندر ہوتا ہے جو بچے کے ساتھ شکمِ مادر سے خارج ہوتا ہے۔ **یخلقکم فی بطون امھتکم خلقا من بعس خلق فی ظلمت ثلث** (سورۂ زمر ۳۹: آیت ۶) "وہ خدا تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں ایک قسم کی پیدائش کے بعد دوسری قسم (جمے ہوئے خون) کی پیدائش سے تین تین اندھیروں پیٹ، رحم اور جھلی میں پیدا کرتا ہے"۔

خدائے قادر نے احسن الخالقین نے انسان بنایا تو بھی ایسی جگہ پر جو ٹھہری ہوئی حالت میں نہیں ہے۔ ایک تو پیٹ ہر وقت ہلتا جلتا رہتا ہے اور پھر پیٹ کے اندر بھی پانی وغیرہ ہوتا ہے۔ ایسی جگہ انسان کی تشکیل ہوئی ہے۔ اور وہ بھی ایسی تشکیل کہ بادام جیسی پیاری پیاری آنکھیں ہیں۔ کشتی جیسے نرم و نازک ابرو ہیں۔ غرض ہر پہلو سے بہترین تصویر کشی ہوئی ہے۔ اگر انسان سوچے کہ اس سے بہتر شکل کسی عضو کی کیا ہو سکتی ہے تو وہ خود لاجواب ہو کر رہ جائے گا۔ تمام مصلحتوں اور تمام ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے یہ نقاشی ہوئی ہے۔ اور اندر کا حال بھی انتہائی حیرت انگیز ہے۔ صنوبر کے پتے جیسا دل بنایا ہے۔ اگر دل کی کوئی اور شکل ہوتی تو ویسا کام نہ کرتا جیسا کر رہا ہے۔

اپنے آپ سے شناسائی خدا سے شناسائی کی ایک راہ ہے۔ خدا کی قدرت

بے انتہا ہے اور کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اسی
لئے اپنے وجود پر غور کرنا معرفت خدا حاصل کرنے کی ایک راہ ہے۔ اس طرح
بنیادی عقائد خود بخود پختہ ہو جاتے ہیں۔ تزکیۂ نفس بھی ہو جاتا ہے۔ دل
قدرت خدا دیکھ کر ہر وقت سجدہ ریز نظر آتا ہے۔

اس طرزِ فکر کا فائدہ

اس طرز فکر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کو بندہ ہونے کا احساس رہتا
ہے۔ وہ بندگی کی طرف آمادہ رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات رہتی ہے کہ
وہ جو کچھ بھی ہے خدا کی وجہ سے ہے اور وہ پورا کا پورا خدا کی ملکیت ہے۔ **ھل
اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا** (سورۂ دھر۷۶ آیت ۱)
یعنی "بے شک انسان پر ایک ایسا وقت آچکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ
تھا"۔

آدمی اس طرح غرور و تکبر کا بھی شکار نہیں ہوتا خود کو دوسروں سے برتر و
بہتر نہیں سمجھتا۔ یہ جانتا ہے کہ اگر خدا نہ ہوتا تو وہ خود بھی نہ ہوتا۔ خدا اگر
اسے طاقت و توانائی نہ دیتا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکتا۔ ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا۔
زندگی اور موت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کی زندگی ہے تو وہ بڑھاپے
کو آنے سے روک نہیں سکتا۔ اگر اس کی موت لکھی ہے تو وہ خود کو موت سے
بچا نہیں سکتا۔

محمود اور ایاز

سلطان محمود اور اس کے غلام ایاز کا قصہ سننے کے قابل ہے۔ ایاز ایک
ذہین شخص تھا۔ معرفت رکھنے والا شخص تھا۔ اتنا اچھا آدمی تھا کہ سلطان محمود
جیسے بادشاہ کی خصوصی توجہ اس پر تھی اور تمام کاموں کے سلسلے میں وہ ایاز پر
بھروسہ کرتا تھا۔

بڑے بڑے رئیس اور جاگیردار قسم کے درباری جلتے تھے کہ ایک غلام
بادشاہ کا اتنا مقرب آدمی بن گیا ہے۔ ایک دن انہوں نے سلطان محمود کو
رپورٹ دی کہ ایاز نے شاہی خزانے میں چوری کی ہے اور چوری کا مال اپنے
کمرے میں مقفل کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ ہر کچھ دن بعد تنہا وہاں جاتا ہے اور
کسی دوسرے کو وہاں جانے نہیں دیتا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ تالا لگا کر باہر نکل آتا
ہے۔ اس طرح تو وہ شاہی خزانہ خالی کر دے گا!

سلطان کو اس رپورٹ پر اعتبار نہیں آیا۔ البتہ اس نے ان بڑے
درباریوں کو ایاز کی حقیقت و عظمت بتانے کے لئے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ایاز کا
مقفل کمرہ کھول دیا جائے اور تالا توڑ دیا جائے۔ پھر جب سب لوگوں نے وہاں
جا کر دیکھا تو کمرے میں پرانے طرز کا ایک فل بوٹ رکھا تھا۔ ایک پھٹا پرانا
جوڑا تھا۔ سخت قسم کی ایک چپل تھی اور پرانی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پڑا ہوا
تھا۔ بس اس کے علاوہ وہاں اور کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا!

حاسد درباریوں کا جی نہیں بھرا۔ انہوں نے شوشا لگایا کہ کمرے کے فرش
کے نیچے خزانہ ہو گا۔ آخر مزدوروں کو بلایا گیا اور کمرے کی خوب کھدائی ہوئی۔
جتنا زیادہ کھودا گیا حاسد درباریوں کے چہرے پر اتنی ہی زیادہ رسوائی کی گرد آتی
گئی۔ تھک ہار کر سب بیٹھ گئے تو سلطان نے ایاز کو بلایا۔ کچھ بیکار سی چیزوں کو
کمرے میں رازداری کے ساتھ مقفل رکھنے کا سبب پوچھا۔ یہ کہہ کر ڈانٹا بھی
کہ کیوں اس طرح تم دوسروں کو بدگمانی کا موقع دیتے ہو۔

ایاز نے عرض کیا: "میں پہلے جھاڑیاں چننے والا ایک بہت غریب آدمی تھا۔
اور اب یہ حال ہے کہ سلطان کا وزیر بن چکا ہوں۔ اپنے پہلے زمانے کی یادگار
چیزوں کو میں نے اسی لئے اٹھا رکھا تھا تاکہ اپنی اصلیت نہ بھولوں۔ میں اس
کمرے میں جایا کرتا تھا۔ خود سے کہا کرتا تھا ایاز، تو وہی جھاڑیاں چننے والا
آدمی ہے۔ یہ تیرا وہی پرانا لباس ہے۔ آج جو تو شاندار لباس پہنے ہوئے ہے تو

تجھے غرور نہیں کرنا چاہئے۔ کج روی اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ خیانت اور ظلم سے پرہیز کرنا چاہئے۔"

یہ سن کر سلطان محمود غزنوی بہت خوش ہوا۔ اس کی نظر میں ایاز کا رتبہ مزید بڑھ گیا۔

یہ تو ہر فرد کی داستان ہے۔ ہر فرد کو چاہئے کہ وہ اپنی اصلیت نہ بھولے۔ یہ نہ بھولے کہ وہ پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کچھ ہوا تو بھی اس کا وجود پانی کے ایک گندے قطرے پر مشتمل تھا۔ اگر آج وہ جیتا جاگتا ایک مکمل انسان ہے تو یہ احسن الخالقین رب العالمین کی مہربانی ہے۔

امام خمینی نے کیا خوب فرمایا ہے: "صدرِ مملکت (بنی صدر) کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ملت نے اسے پیرس سے وطن واپس بلایا ہے۔ وزیر اعظم (محمد علی رجائی) کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ملت نے اسے جیل سے رہائی دلائی ہے۔ ان لوگوں کو ان کا عہدہ کہیں فریب کا شکار نہ کردے!"

غفلت بدترین بلا ہے

معرفت رکھنے والے حضرات نے فرمایا ہے کہ غفلت بدترین بلا ہے۔ خدا سے غافل ہونا سخت نقصان دہ ہے۔ **نسوا اللہ فانسھم انفسھم** (سورۂ حشر ۵۹: آیت ۱۹) یعنی: "وہ لوگ خدا کو بھلا بیٹھے تو خدا نے انہیں ایسا کردیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔" **اولئک ھم الفاسقون** "ایسے ہی لوگ تو بدکردار ہیں۔"

جی ہاں ایسے ہی لوگ ایسے امور میں مگن رہتے ہیں جو ذات سے اور روح سے بے ربط ہوتے ہیں۔ مالِ دنیا، شان و شوکت اور دنیا بھر کی سرگرمیوں میں لگے رہتے ہیں۔ کھانے پینے، نفسانی خواہشات کا پیٹ بھرنے، اقتدار کی ہوس کرنے اور شان و شوکت دکھانے ہی میں سارا وقت گزار دیتے ہیں۔ ایسے کاموں میں اتنے "مصروف" ہو جاتے ہیں کہ روح کی ضروریات کا خیال دل میں لانے تک کی فرصت نہیں ملتی دوسروں سے دنیاداری میں آگے بڑھ جانے

کی دُھن لگی رہتی ہے۔ شہرت کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ اور جس بات کا دھیان نہیں آتا وہ شریعت کی پابندی ہے حالانکہ اسی پر نجات کا دارومدار ہے۔

صرف خدا کے لئے

دنیادار آدمی خدا کو بھول جاتا ہے اور خدا کے علاوہ سب کچھ اسے یاد رہتا ہے۔ اس کے دل سے خوف خدا نکل جاتا ہے اور خدا کے علاوہ وہ ہر چیز کے آگے جھکا جاتا ہے۔ گویا ہر چیز اور ہر شخص کے لئے خضوع و خشوع پیدا کرلیتا ہے حالانکہ یہ صرف خدا سے مخصوص ہونا چاہئے تھا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کی طرح خدا کے محتاج ہیں۔ **یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ و اللہ ھو الغنی الحمید** (سورۂ فاطر ۳۵: آیت ۱۵) "لوگو! تم سب کے سب خدا کے ہروقت محتاج ہو اور صرف خدا ہی سب سے بے نیاز ہے اور حمد و ثنا کا سزاوار ہے۔" امیر طبقہ غریب طبقے پر برتری نہیں رکھتا ہے۔ خدا کے نزدیک برتری کا معیار تقویٰ ہے۔ یہ بالکل بیہودہ اور غلط بات ہے کہ ایک انسان دوسرے کا ہر جائز و ناجائز حکم میں تابع ہو کر رہ جائے اور افسر اور ماتحت دونوں نفسانی خواہشات کے غلام ہی نظر آئیں۔

تقویٰ کا راستہ آزادی کا راستہ ہے

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: **ان تقوی اللہ عتق من کل ملکۃ** (نہج البلاغہ) ہر کسی کا مالک خدا ہے اور ہر کوئی خدا کی ملکیت ہے۔ پس مولا فرما رہے ہیں "اگر آدمی خدا کا تقویٰ اختیار کرے، خدا ہی سے ڈرے، ہر بات میں حکم خدا مدنظر رکھے تو یہ تقویٰ اسے دیگر لوگوں کی بیجا حاکمیت سے آزاد کردیتا ہے۔"

متقی شخص نہ صرف یہ کہ دوسروں کا غلام نہیں بنتا بلکہ اپنے نفس کا بھی غلام نہیں بنتا۔ نفسانی خواہشات کا اسیر ہو کر نہیں رہ جاتا۔ شیخ بہائی اعلی اللہ

مقامۂ فرماتے ہیں: "غیر متقی شخص اگر تقویٰ اختیار کرلے تو آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ اب تک تو وہ ایک کتے کو سجدہ کر رہا تھا۔ اور وہ کتا اس کا نفس ہی تو تھا!"

آدمی اگر بادشاہ بننا چاہے تو اسے اس راہ میں کتنی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اور کس کس کی غلامی اپنانی ہوتی ہے! محمد رضا شاہ کو آپ لوگوں نے فراموش نہیں کیا ہوگا۔ امام خمینی فرماتے ہیں کہ میں نے امریکی صدر کے ساتھ کھینچی گئی اس کی ایک تصویر دیکھی، جس میں وہ ایک غلام کی طرح اس کی سامنے کھڑا ہوا تھا۔

نفس کی غلامی تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور اس میں ہر طرح کی ذلت ہوتی ہے۔ آدمی کو دنیا میں یہ اختیار ہے کہ وہ آزاد زندگی گزارے یا نفس کا غلام ہو کر بسر کرے۔ رسول خداؐ کا ارشاد ہے: **المحیی محیاکم والممات مماتکم** "تم چاہو تو زندگی کو زندگی قرار دے دو اور موت کو موت۔" یعنی چاہو تو اس طرح زندگی گزارو جس طرح زندگی کا حق ہے اور چاہو تو اس زندگی کو موت کی مانند بنا ڈالو۔ جی ہاں، نفس کی غلامی نفس کی موت ہے اور اس غلامی سے آزاد ہو کر رہنا ہی اصل زندگی ہے!

البتہ غلامی صرف ایک خدا کی شائستہ ہے۔ بندگی کے لائق صرف ذات خدا ہے۔ یہ بڑے لوگ بڑے نہیں ہیں، بڑا صرف خدا ہے!

چودہ قسمیں

نفس کو آراستہ کرنا، تزکیۂ نفس، یا روح کو پاک و پاکیزہ بنانا دراصل نفس کو بیجا خواہشات کی قید سے رہا کرانا ہے۔ تزکیۂ نفس کے سلسلے میں جتنی تاکید قرآن مجید میں موجود ہے اتنی تاکید کسی اور چیز کے لئے نہیں ہوئی ہے۔ ایک سورۂ شمس ہی کو لے لیجئے۔ اس میں خداوند تعالیٰ چودہ قسمیں کھا رہا ہے اور پھر فرما رہا ہے کہ وہی نجات کا حقدار ہے جس نے تزکیۂ نفس کیا اور جس شخص نے اسے آلودگی میں چھوڑ دیا وہ گمراہی میں پڑ گیا! (سورۂ شمس ۹۱: آیات ۱ تا ۱۰)

پس ہم کو خودسازی کی کوشش کرنی چاہئے۔ خود کو یعنی اپنے نفس کو آراستہ اور پاکیزہ بنا کر رکھنا چاہئے۔ نہ دوسروں کی غلامی ہو اور نہ اپنے نفس کی غلامی ہو۔ پابندی ہو تو صرف حکم خدا کی پابندی ہو۔ حکم خدا کی حد میں رہتے ہوئے جس قدر آزادی میسر ہے وہی حقیقی آزادی ہے۔ ورنہ انسان اندر اور باہر ہر طرف سے غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔

آج کے درس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہمیں غفلت نہیں کرنی چاہئے۔ غور و فکر کو بدن کی خلقت کے راستے پر لگانا چاہئے تاکہ اس راہ سے ہم معرفت خدا کی ابتدائی منزل تک پہنچ سکیں۔ قدرت خدا سے آشنائی پیدا کرسکیں اور خودپرستی یا غرور و تکبّر چھوڑ سکیں۔

☆☆ ...... ☆☆ ...... ☆☆

دوسرا درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقل کی قوت

خدائے تعالیٰ نے انسان کو کئی مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ ہر صلاحیت کسی نہ کسی مقصد کے تحت عطا کی ہے۔ اب یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صلاحیت کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرے جس مقصد کی خاطر وہ عطا کی گئی ہے۔ ظاہر ہے اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ اپنی اس صلاحیت کے فائدے اور مقصد سے محروم رہے گا۔

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت انسان کی تمام دیگر صلاحیتوں سے زیادہ عظیم ہے۔ علم اخلاق کی اصطلاح میں اس صلاحیت کو "عقل کی قوت" کہتے ہیں۔ انسان کو اسی قوت کی وجہ سے حیوانات پر امتیاز حاصل ہے۔ البتہ انسان اسی وقت دیگر حیوانات سے ممتاز ہے جبکہ وہ عقل کی قوت اس کے اصل مقصد میں لگائے۔ اس قوت کا اصل مقصد غور و فکر ہے۔ اپنی ذات پر غور و فکر اپنی ابتداء اور انتہا پر غور و فکر۔ اپنے خالق کے سلسلے میں غور و فکر۔ اپنے آخری انجام سے متعلق غور و فکر۔ اگر عقل کی قوت ایسے غور و فکر میں لگائی جائے تو انسان کو وہ سعادت حاصل ہو جاتی ہے جس کے لئے اسے خلق کیا گیا ہے۔ انسان کو سعادت حاصل کرنے کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ معرفتِ خدا کی سعادت۔ عبادت خدا کی سعادت۔ دُنیوی اور اُخروی نعمتوں کی سعادت۔ جنّت کی سعادت۔ اور قرب خدا کی سعادت۔ یہ ہے مقصد خلقت انسان۔

اگر عقل کی قوت اپنے اصل مقصد میں استعمال نہ ہو تو یہ قوت کج روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ انسان کو چالاکی اور مکّاری کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ ایسی صورت میں انسان حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ بلکہ تمام مخلوقات سے اس کا رتبہ پست ہو کر رہ جاتا ہے اور آخر کار واصل جہنم ہوتا ہے۔ **وقالوا**

لو کنا نسمع او نعقل ماکنا فی اصحب السعیر (سورۂ مُلک ۶۷ : آیت ۱۰)

یعنی: "دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم بات سنتے یا غور و فکر کرتے تو آج دوزخیوں میں نہ ہوتے"۔

پس انسان کو غور و فکر کرنا چاہئے کہ وہ پہلے کیا تھا۔ خدا نے ایک نجس قطرے کو جمے ہوئے خون میں تبدیل کیا۔ اس کو سڈول سے لوتھڑے کی شکل دی۔ اس میں ہڈیوں کا جال بچھایا۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت کو پروان چڑھایا۔ جب تمام اعضاء اچھی طرح بن گئے تو اسے روح عطا کی اور پھر اسے دنیا دیکھنے اور دنیا میں سعادت کی فکر کرنے کے لئے بھیج دیا۔ (ملاحظہ کیجئے سورۂ حج ۲۲: آیت ۵)

اس طرح غور کر کے وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور یہی معرفت نجات و سعادت کی ایک بنیادی کلید ہے۔

خالق و مخلوق

انسان کو غور کرنا چاہئے کہ آیا کوئی چیز خود بخود بغیر کسی خالق کے پیدا ہو سکتی ہے؟ عقل یہی جواب دے گی کہ نہیں ہر مخلوق کے لئے خالق کی ضرورت ہے۔ مرحوم سید ابن طاؤس "کتاب "کشف المحجہ" میں فرماتے ہیں: یہ نہ صرف عقل کہتی ہے بلکہ انسان کی فطرت بھی یہ بتاتی ہے کہ ہر مخلوق کا کوئی نہ کوئی خالق ہوتا ہے۔ دو تین سال کا بچہ اگر بیٹھا ہو اور آپ اس کے پیچھے سے جا کر ہاتھ بڑھائیں اور ایک دلچسپ چیز اس کے سامنے رکھ دیں تو اس چیز کی طرف باقاعدہ متوجہ ہونے سے پہلے وہ دو تین سال کا ناسمجھ بچہ فطری طور پر پیچھے مڑ کر دیکھے گا کہ یہ چیز لایا کون ہے؟

ایک اور بات انسان عقلی اور فطری طور پر جان سکتا ہے کہ مخلوق میں جو کمالات ہیں وہ خالق کے کمالات بھی ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ عقل رکھنے والے انسان کا خالق دانا اور حکیم نہ ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ زندگی اور حیات دینے

والا خالق محض مادہ ہو اور زندہ نہ ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قدرت و توانائی عطا کرنے والا خالق خود قادر نہ ہو۔

ایک چھوٹی سے گھڑی کو لے لیجئے اس کی مشین کس طرح باقاعدہ کام کرتی ہے۔ اسے دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ گھڑی ایجاد کرنے والا شخص بہت سمجھدار اور عقل والا ہے۔ البتہ اس کی عقل اس کی حد میں ہے۔ اب آپ اس پوری کائنات کو لے لیجئے۔ باقاعدہ کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ ہر چیز اپنے محور پر درست گردش کر رہی ہے۔ کوئی ستارہ یا سیارہ زمین سے نہیں ٹکراتا۔ اور زمین میں بھی انسانی ضرورت کی ہر چیز مناسب مقدار میں موجود ہے۔ ہر چیز ضرورت کے عین مطابق خلق ہوئی ہے۔ اتنا بڑا نظام کائنات لامحدود علم و قدرت کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ پس اس کائنات کا خالق لامحدود علم و قدرت رکھتا ہے۔ خود کائنات کی حد اور سرحد انسان نہیں بتا سکتا تو خالق کائنات کی صفات کی کیا حدیں ہوں گی!

خود بدن کا کارخانہ ایک چلتا پھرتا عجائب گھر ہے۔ سر سے پیر تک انسان اتنے مناسب اعضاء کے ساتھ خلق ہوا ہے کہ ہر ایک کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ صرف باہر سے نہیں بلکہ اندر سے بھی انسان اتنے مناسب انداز میں بنا ہے کہ رگ رگ میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔ غرض ایسی بے شمار چیزیں انسان کو دنیا میں ملیں گی جن سے وہ معرفت خدا حاصل کر سکتا ہے۔

ناخن کی اہمیت

ناخن ہی کو لے لیجئے۔ بظاہر بیکار نظر آتے ہیں۔ بار بار بڑھ جاتے ہیں تو کاٹنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بھی بے مقصد نہیں ہیں۔ ناخن اگر نہ ہوں تو انسان بھاری چیزیں نہ اٹھا سکے۔ ناخنوں کی وجہ سے انگلیوں کی ہڈیوں کو سہارا ملتا ہے اور انسان بھاری چیز اٹھانے کے قابل بن جاتا ہے۔ آپ ایسے آدمی سے پوچھیں جس کا ناخن اکھڑ چکا ہو۔ وہ گواہی دے گا کہ بھاری چیز اٹھانے میں اسے دقت ہوتی ہے۔

اور جس طرح بال بڑھ جاتے ہیں تو کاٹنا پڑتا ہے اسی طرح ناخن بھی ہیں۔ پسینہ اور پیشاب پاخانہ بھی اسی حکم میں ہیں۔ دراصل آدمی جو کچھ کھاتا پیتا ہے تو اس کا کچھ حصہ بدن کا جزو بن جاتا ہے اور باقی حصہ ان مذکورہ چیزوں کی شکل میں خارج ہو جاتا ہے۔ اب ناخن کی شکل میں غذا کا جو حصہ بدن سے خارج ہوتا ہے اس میں بھی مصلحت ہے۔ ناخن یا بال اگر پرانے ہو جائیں تو ٹوٹ پھوٹ جائیں۔ لیکن اگر اندر سے ابھرتے ہیں اور باہر سے کٹتے رہیں تو ان کی تازگی اس حد تک برقرار رہتی ہے کہ وہ انسان کی ضرورت کے عین مطابق بنے رہتے ہیں اور خوبصورتی بھی باقی رہتی ہے۔

پاؤں کا تلوا

بحار الانوار جلد نمبر ۱۴ میں ایک حدیث ہے کہ ہندوستان کا ایک غیر مسلم حکیم مدینہ منورہ آیا۔ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہنچا اور یہ دعویٰ کرنے لگا کہ وہ علم و حکمت کی ہر بات جانتا ہے۔ حضرتؑ نے اس سے سوال کیا "یہ پاؤں کا تلوا درمیان سے اندر دبا ہوا کیوں ہے؟"

وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ پھر کہنے لگا "میں نہیں جانتا، آپ خود بتا دیجئے۔"

امامؑ جعفر صادقؑ نے فرمایا "اگر پیر کا تلوا ہموار اور سپاٹ ہوتا تو چلنا مشکل ہو جاتا۔ اب جو یہ اندر دبا ہوا ہے تو اس کے باعث پیدل چلنا آسان ہے۔"

امامؑ نے ایک پتھر کی مثال بھی دی اور فرمایا کہ زمین پر رکھا ہوا ایک پتھر اگر پورا کا پورا نیچے زمین سے لگ رہا ہو تو اسے اٹھانا ایک ایسے پتھر کی نسبت زیادہ مشکل ہے جس کے کنارے زمین سے لگ رہے ہوں اور کہیں کہیں وہ نہیں لگ رہا ہو۔ اور ایسے پتھر کو بھی اٹھانا آسان ہے جس کے کنارے گول ہوں۔ لیور یا ڈنڈے وغیرہ کے ذریعے ایسے پتھر کو زیادہ آسانی سے اٹھایا جا سکتا

ہے اور ایسا پتھر اٹھانا زیادہ مشکل ہوتا ہے جس کی نچلی سطح مکمل طور پر زمین سے لگ رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پیر کے تلوے میں گولائیاں بھی موجود ہیں۔

کیا وہ نہیں جانتا؟

الا یعلم من خلق (سورہ ملک ۶۷: آیت ۳) "کیا وہ نہیں جانتا کہ اسے کس نے خلق کیا ہے؟ کیا اس کا خالق محض مادہ (MATTER) ہے؟ کیا یہ بات اس کی عقل ماننے پر تیار ہے؟"

کہنے والا کہتا ہے کہ ہم ہر جگہ گئے۔ چاند پر بھی گئے۔ دیگر سیاروں کے پاس سے بھی گزرے۔ لیکن ہم نے خدا کو نہیں دیکھا۔ میں کہتا ہوں کہ تمہاری بینائی اور دیکھنے کی قوت بہت محدود ہے۔ تمہاری عقل کی رسائی ان چیزوں تک بھی ہے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے ہو مگر جن کا تم اقرار کرتے ہو۔ تم ہوا نہیں دیکھتے مگر تم اس کا اقرار کرتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ پورے کرہ ارض کو ہوا گھیرے ہوئے ہے۔ تمہاری سونگھنے کی قوت چیزوں کا وجود پہچاننے کے سلسلے میں تمہاری بینائی سے بڑھ کر ہے۔ تم پھول دیکھ سکتے ہو مگر اس کی خوشبو دیکھ نہیں سکتے۔ خوشبو کا وجود تمہاری سونگھنے کی قوت نے دریافت کیا ہے۔ غرض ایسی بہت سے چیزیں ہیں جنہیں تم دیکھے بغیر تسلیم کرتے ہو۔ بجلی کی قوت کا تم انکار نہیں کر سکتے حالانکہ تم اسے دیکھتے نہیں ہو جو تاروں میں دوڑا کرتی ہے۔ پس یہ کہنا معقول نہیں ہے کہ جو چیز ان آنکھوں سے نظر نہ آئے وہ موجود ہی نہیں ہے۔

قیامت کی بات

انہ علی رجعہ لقادر (سورۂ طارق ۸۶: آیت ۸) "بے شک خدا اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قدرت رکھتا ہے۔"

خدا پر اور اس کے وجود پر فکر کرنے کے بعد یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اتنی

عظیم کائنات کا انجام کیا ہوگا؟ اتنی عظیم کائنات خلق کرنے کا آخر کوئی مقصد تو ہوگا؟ اتنی مخلوقات کی خلقت بے مقصد تو نہیں ہو سکتی۔ اتنی بڑی دنیا اور اس کے تمام لوازمات سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کے لئے ہیں۔ اب کیا انسان کو محض اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ کھائے، پیئے، سوئے، بچے پیدا کرے اور مر جائے؟ یہ تو سب نامعقول لگے گا اگر انسان کی خلق کا یہی مقصد ہو۔ **افحسبتم انما خلقناکم عبثا و انکم الینا لا ترجعون** (سورۂ مومنون ۲۳: آیت ۱۱۵) یعنی "تو کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو یوں ہی بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے حضور میں لوٹا کر نہ لائے جاؤ گے۔"

واقعاً" اگر قیامت نہ ہو تو پوری کائنات کی خلقت لغو اور نامعقول قرار پائے۔ آدمی اس لئے پیٹ بھرے کہ خالی کرنا ہے اور اس لئے پیٹ خالی کرے کہ دوبارہ بھرنا ہے تو یہ نامعقول نہیں تو اور کیا ہے؟ پس انسان کی خلقت کا مقصد کچھ اور ہے۔ اس کی منزل کوئی ہے۔ انسان محض اس دنیا کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے۔ انسان کسی اور عالم کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اگر وہ عالم منزل مقصود نہ ہو اور یہی دنیا منزل مقصود ہو تو یہ انسان کی شان کے خلاف ہے۔ اگر پیغام وحی نہ ہو تب بھی عقل کہتی ہے کہ جس دنیا میں اتنی تکلیفوں، اتنی زحمتوں، اتنی بیماریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہو، تب کہیں جا کر کچھ سہولتیں انسان عارضی طور پر حاصل کر لیتا ہو ایسی دنیا اس کی منزل مقصود قرار پانے کے لائق نہیں ہے۔ فکر کی پرواز بار بار بتاتی ہے کہ انسان فطری طور پر لامحدود کمالات تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اپنی ہمت کی بیکراں حدود کو چھونا چاہتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ایک ایسی دنیا ہو جہاں کوئی تکلیف ہی نہ ہو اور فکر کی حدوں کے عین مطابق راحت ہی راحت ہو۔

اگر کوئی کہے کہ مٹی بن جانے کے بعد انسان اس طرح دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے تو اس کا جواب اسی مذکورہ آیت میں ہے۔ **انہ علی رجعہ لقادر** جس خدا

نے انسان کو معدوم سے موجود بنایا ہے، جو پہلے تھا ہی نہیں اسے وجود بخشا ہے وہ خدا اس بات پر بھی قادر ہے کہ بکھرے ہوئے مٹی کے ذرات دوبارہ جوڑ کر اسی انسان کو زندہ کر دے۔ ایک بڑھئی سے اگر کہا جائے کہ الماری بناؤ تو وہ پہلے لکڑی اور کیلیں وغیرہ فراہم کرے گا اور پھر بنانے بیٹھے گا۔ اگر اس سے کہا جائے کہ ان لوازمات کے بغیر الماری بناؤ تو وہ یہی کہے گا کہ یہ تو مجھ سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مادہ (MATTER) موجود ہو تو اسے دوسری شکل کا مادہ بنانا آسان ہے لیکن مادہ ہی موجود نہ ہو تو مادے کو وجود میں لا کر کوئی چیز بنانا نہ صرف یہ کہ مشکل ہے بلکہ انسان کے بس سے باہر ہے۔ پس عدم سے وجود بخشنا جب خدا کے لئے ممکن ہے تو بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹنا بھی بالکل ممکن ہے۔

و ان من شی الا عندنا خزائنہ و ما ننزلہ الا بقدر معلوم (سورۂ حجر ۱۵ : آیت ۲۱) "ہمارے ہاں تو ہر چیز کے بے شمار خزانے بھرے پڑے ہیں اور ہم اس میں سے جنچی تلی مقدار بھیجتے رہتے ہیں۔"

یہ دنیا خدا کی قدرت و حکمت کا ایک نمونہ ہے۔ ہر چیز جنچی تلی اور مناسب مقدار میں موجود ہے۔ یہ دنیا خدا کے خزانہ غیب سے نکلا ہوا ایک سکہ ہے۔ گلستان قدرت کے بے شمار پھول میں سے ایک خوشنما پھول ہے جس سے طرح طرح کی خوشبو بکھرتی رہتی ہے۔ خزانہ قدرت میں خوشبوؤں کا جو ذخیرہ ہے اس میں بہترین خوشبو محمدؐ و آل محمدؐ کی خوشبو ہے۔ وہ خوشبو دراصل جنت ہی کے لائق ہے۔ لیکن محدود مدت کے لئے اس دنیا کو بھی بقدر ظرف اس کی چھوٹ سے استفادے کا موقع حاصل ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ بہشت کی خوشبو دو ہزار سال کی مسافت تک چھوٹتی رہتی ہے۔ خود بہشت خدا کے خزانہ قدرت کا ایک سکہ ہے۔ قدرت کے پھیلے ہوئے بیکراں باغ کا ایک انتہائی خوشبودار پھول ہے۔

پھر خزانہ قدرت کتنا بڑا ہوگا؟!

البتہ ضمنی طور پر ایک مفید روایت بھی نقل کر دوں۔ ارشاد ہے کہ بہشت کی اتنی زبردست خوشبو ہونے کے باوجود اور بہشت سے باہر اتنی دور تک اس کا پھیلاؤ ہونے کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسے سونگھ بھی نہیں سکیں گے۔ ان میں سرفہرست وہ لوگ ہیں جو رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحم نہیں کرتے، مناسب سلوک نہیں کرتے اور جو والدین کے ہاتھوں عاق ہو جاتے ہیں۔

تقویٰ کا فائدہ

ارشاد ہے **و ازلفت الجنتہ للمتقین** (سورۂ شعرآء ۲۶ : آیت ۹) "اور بہشت پرہیزگاروں کے قریب کر دی جائے گی"۔

یہ بھی ارشاد ہے کہ **اعدت للمتقین** (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۳۳) "جنت متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔"

خدائے تعالیٰ نے جنت ایسے لوگوں کے لئے بنائی ہے جو گناہوں اور برائیوں سے پرہیز کرتے آئے ہوں۔ جو دنیاداری میں اور نفسانی خواہشات کی بیجا لپیٹ میں نہ آئے ہوں۔ **ولکنتہ اخلدالی الارض واتبع ھوہ** (سورۂ اعراف ۷ آیت ۱۷۶) "لیکن وہ تو دنیاداری کی پستی میں پڑا ہوا ہے اور نفسانی خواہشات کی دلدل میں دھنسا جا رہا ہے۔"

قیامت کے دن متقی حضرات کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے جائیں گے۔ **یوم تبلی السرائر** (سورۂ طارق ۸۶ : آیت ۹) دنیا میں رہتے ہوئے بہت سی چیزیں نظر نہیں آتیں لیکن قیامت میں ان چیزوں کی صورت نظر آئے گی۔ واقعی انسان ایک عجیب چیز ہے۔ اس میں بھیڑیئے جیسی درندگی بھی ہے تو بھیڑ جیسی بزدلی بھی۔ اس میں خنزیر کی طرح شہوت بھی ہے اور لومڑی کی طرح مکاری بھی۔ البتہ اس میں فرشتوں کی طرح خیرخواہی اور ہمدردی کی خاصیت

بھی ہے۔ دنیا میں اسے بھیجا گیا ہے تاکہ وہ بھلے برے کی تمیز کرے اور برے کو چھوڑ کر بھلے ہی کو گلے لگالے۔

بُلندی اور ترقی کی فکر

جس کی زندگی کا سب سے اہم کام پیٹ بھرنا ہو اس میں اور بکرے میں کیا فرق ہے۔ دنیا سے یونہی گزر جاتا ہے۔ نہ کوئی معرفت نہ کوئی کمال۔ بس حیوانیت ہی حیوانیت اس کی زندگی پر محیط رہتی ہے۔ ایسا شخص اگر قدرت و اقتدار چاہے تو درندہ بن جاتا ہے اور غرور و تکبر اس کی عادت بن جاتی ہے۔ کسی کو خود سے برتر دیکھنا اسے پسند نہیں ہوتا۔ چیتے کی طرح اس پر حملہ کر کے خود سے پست ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا یہ سلوک ہوتا ہے کہ اگر بھوکا نہ ہو تو ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا لیکن دوسری صورت میں وہ اس کی زد میں ہوتے ہیں۔ اس کی نظر میں بلندی اور ترقی کا معیار یہی رہ جاتا ہے۔ اپنے رقیب کو ہر صورت میں نیچا کر دکھانا اس کا نصب العین بن جاتا ہے خواہ اسے کوئی جرم کرنا پڑے یا کسی طرح کا بھی ظلم ڈھانا پڑے۔ شہرت کا طالب انسان بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ الغرض جس کی نظر میں راہ خدا نہیں، بلکہ کوئی اور راہ ہوتی ہے وہ آنکھ بند کر کے اندھا دھن اس پر چل پڑتا ہے۔ اور آخر کار ہلاکت کی دلدل اسے لے ڈوبتی ہے۔

لالچ بُری بلا ہے

کبھی آدمی مال و دولت کے حرص میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بعض جانور اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً چیونٹی جو کچھ ملتا ہے اسے آئندہ کے لئے ذخیرہ کرنے کی دھن میں لگی رہتی ہے۔ چوہا بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ محمد رضا پہلوی تو لاکھوں تومان باہر بھیجتا رہتا تھا تاکہ اگر کبھی ایران چھوڑ دینے کی نوبت آئے تو باقی زندگی وہ عیش سے گزار سکے۔ لالچ کی صفت بہت سے جرائم کا سبب بنتی ہے۔

خیانت، چوری، ڈاکہ، ناانصافی، گراں فروشی، ملاوٹ حتیٰ کہ قتل جیسے جرائم بھی لالچ کے سبب ہو جاتے ہیں۔ آدمی خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کی حفاظت ہمیشہ کر سکتا ہے۔ **یحسب ان مالہ اخلدہ** (سورۂ ہمزہ ۱۰۴ آیت ۳)

انسان نہیں جانتا کہ مال ہو یا اقتدار، شہرت ہو یا آسائش کا کوئی سبب، یہ سب چیزیں فانی ہیں۔ دنیا ہی میں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اسے سمجھنا چاہئے کہ ایسی چیزیں ہمیشہ اس کا ساتھ دینے والی نہیں ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا کی مختصر زندگی میں ایسی چیزیں انسان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔ پس ایسی چیزوں کی حرص کرنے سے کیا فائدہ۔ جستجو ایسی چیز کی ہونی چاہئے جو دائمی طور پر مفید ہو۔ زندگی بھر جس کا ساتھ یقینی ہو اور زندگی کے بعد بھی جس سے ڈھارس بندھی رہے۔ ایمان کے ساتھ ساتھ عمل خیر ہی تو وہ چیز ہے جو اس لائق ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے غلام قنبر کے ساتھ ایک دن بازار گئے۔ وہاں انہوں نے دو قمیضیں خریدیں۔ جو قمیض بہتر تھی وہ انہوں نے قنبر کو دے دی۔ قنبر نے عرض کیا "آپؑ میرے آقا ہیں اور مسلمانوں کے خلیفہ ہیں۔ آپؑ کے لئے بہتر قمیض مناسب ہے۔" حضرتؑ نے فرمایا "مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں خود کو تم پر ترجیح دوں اور خود کو تم سے بہتر سمجھوں! علی بھی مخلوق ہے اور قنبر بھی مخلوق ہے۔ اگر علی کو کوئی منصب ملا ہے تو وہ خدا نے دیا ہے۔ ورنہ مخلوق خدا ہونے کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں!"

علیؑ کے شیعوں کو علیؑ کی ایسی باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ دوسروں کو خود سے پست نہیں سمجھنا چاہئے۔ مادی چیزوں میں لالچ کی حد تک آگے نہیں بڑھ جانا چاہئے۔ یہ تو پستی کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ بلندی دوسروں کی خدمت کرنے میں مضمر ہے۔ بلندی تو یہ ہے کہ انسان خود زحمت اٹھا کر دوسروں کو سہولت فراہم کرے۔ انسانیت یہ نہیں ہے کہ اپنی سہولت کی خاطر دوسروں کو زحمت میں ڈال دیا جائے۔

زائر حسینؑ کا احترام

نجف اشرف کے ایک مجتہد اخوند مُلّا حُسین علی کی خدمت میں حسب معمول جب ان کا ایک شاگرد ایک دن پڑھنے آیا تو انھوں نے دریافت کیا "کل رات تم نے کوئی خاص عمل انجام دیا ہے؟" شاگرد نے عرض کیا "جی نہیں، کوئی نہیں۔" جب استاد نے زور دیا تو شاگرد کہنے لگا "رات میں کچھ مہمان کربلا سے نجف عید غدیر کی مناسبت سے زیارت کے لئے آئے تھے۔ کمرہ چھوٹا تھا۔ ہم سب مرد ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے۔ شائد آدھی رات کے قریب مجھے اپنے سینے پر بوجھ سا محسوس ہوا جس کی وجہ سے میں بیدار ہو گیا۔ دراصل سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک مہمان گہری نیند میں کچھ اس طرح اپنی جگہ بدل چکا ہے کہ اس کے دونوں پیر میرے سینے پر آ گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ پیروں کو نیچے اتار دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ وہ مہمان بھی ہے، زائر حسینؑ بھی ہے اور عالم دین بھی۔ اور پیغمبرؐ کا ارشاد ہے **اکرموا الضیف** مہمان کا احترام کرو۔ لہٰذا باقی رات میں نے ایسے ہی گزار دی اور مہمان کی نیند میں ذرا سے بھی خلل کا سبب نہیں بنا۔"

استاد نے فرمایا "یہی وجہ ہے کہ میں تم میں ایک ایسا نور دیکھ رہا ہوں جو کل نہیں تھا! تم سمجھتے ہو کہ تمہارا یہ عمل معمولی ہے!!"

کانٹا اور پھول

انسان کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ دوسروں کو راحت پہنچانے والا اگرچہ اس سلسلے میں خود اسے زحمت اٹھانی پڑے۔ دوسروں کا بوجھ اٹھانے والا بننا چاہئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ خود دوسروں پر بوجھ بنے۔ زمین پر گر جانے والے کو بڑھ کر سہارا دینا چاہئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ خود جلدی آگے بڑھ جانے کی فکر میں دوسروں کو گرا دے۔ بھوکے کو پیٹ بھر کر کھلانے والا ہونا

چاہئے، دوسرے کی روزی پر لات مارنے والا نہیں۔ دوسرے کا احترام کرنے والا ہونا چاہئے، اپنی جھوٹی عزت کی خاطر دوسرے کو ذلیل کرنے والا نہیں۔ فرشتہ صفت بننا چاہئے، درندہ صفت نہیں۔ فرشتوں کی طرح خیر و رحمت پہنچانے والا بننا چاہئے۔ جانوروں کی طرح بس اپنی فکر میں مگن نہیں رہنا چاہئے۔ جو شخص دنیا میں بھلائی کرتا ہے آخرت میں بھلائی ہی بھلائی اسے میسر آتی ہے۔ اور جو شخص دنیا میں برائی کرتا ہے آخرت میں برا ہی نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ جو شخص دنیا میں فرشتہ صفت ہوتا ہے وہ فرشتوں سے بڑھ جاتا ہے۔ **و الملئکۃ یدخلون علیھم من کل باب** (سورۂ رعد ۱۳: آیت ۲۳) "فرشتے بہشت کے ہر ہر دروازے سے ان کے پاس ملاقات کے لئے آئیں گے۔" نہ صرف بہشت میں بلکہ قبر میں بھی شب اول سے آتے رہیں گے اور ہر حال میں اس کا خیال رکھیں گے۔ اس لئے کہ وہ دنیا میں پھول بن کر مفید بھی ثابت ہوتا رہا اور کانٹا بن کر تکلیف دہ نہ بنا۔

بشیر اور مُبشر کون ہیں؟

آپ نے سنا ہو گا کہ پہلی رات قبر میں دو فرشتے مردے سے پوچھ گچھ کے لئے آتے ہیں۔ ان کا مشہور نام منکر اور نکیر ہے۔ یہ دونوں لفظ "نکر" سے نکلے ہیں جس کے معنی ہیں تکلیف پہنچانا اور سزا دینا۔ یہ دونوں فرشتے ایسے مردے کو سزا دیتے ہیں جو دنیا میں کانٹا بن کر رہا ہو۔ البتہ یہی دونوں فرشتے جنت کی بشارت دینے لگتے ہیں اگر انسان دنیا میں انسان بن کر رہا ہو اور پھول کی طرح غیر مضر ثابت ہوتا رہا ہو۔ مبشر اور بشیر انہی دونوں فرشتوں کا نام ہے۔ یہ دونوں لفظ بشارت یعنی خوشخبری سے نکلے ہیں۔ معلوم ہوا کہ آدمی دنیا میں جیسا بوتا ہے دنیوی زندگی کے بعد ویسا ہی کاٹتا ہے۔ کانٹے بونے والا، کانٹے ہی پاتا ہے اور پھول اگانے والا، پھول ہی حاصل کرتا ہے۔ جو شخص دنیا میں کشادہ دل ہوتا ہے قبر میں اسے تنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ قبر کے بعد کی منزلوں میں بھی اسے کوئی

تنگی نہیں ہوتی۔ لیکن جو شخص دنیا میں تنگ دلی اور سنگ دلی کا سلوک کرتا ہے قبراور اس کے بعد کی منزلوں میں اسے تنگی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

☆☆......☆☆......☆☆

تیسرا درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان

اسی ہفتے امام خمینی نے کئی مرتبہ فرمایا ہے کہ یونیورسٹی اور کالج طلبہ کو اور عزیز جوانوں کو مہذّب بن جانا چاہئے۔ دینی طلبہ کو بھی مہذّب بن جانا چاہئے۔ اگر تہذیب نہ ہو تو انسان معاشرے کے مفید نہیں بلکہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے انسان کا نقصان اگر وہ مہذب نہ ہو تو دوسرے عام غیر مہذب لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ ایسا انسان نہ صرف یہ کہ خود خراب ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی خراب کرتا ہے۔ ہماری ملت کو نقصان پہنچانے والے لوگ یہی پڑھے لکھے افراد تو رہے ہیں۔ تعلیمی مراحل جنہوں نے طے نہیں کئے ہیں اگر وہ مہذب نہ ہوں تو بھی اتنے خراب نہیں ہوتے کہ دوسروں کو زیادہ خراب کر سکیں۔ غیر مہذب پڑھا لکھا آدمی یا غیر مہذب عالم دین جتنا نقصان دہ ہوتا ہے اتنا نقصان دہ کوئی اور نہیں ہوتا۔

اسی لئے دین و شریعت کی اساس انسان سازی ہے۔ آدمی کو صحیح معنوں میں انسان بننا ہے۔ پیغمبروں کی ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگ تہذیب یافتہ ہو جائیں۔ اسلامی تہذیب سے آشنا ہو جائیں۔ قرآن مجید کا سارا زور اسی موضوع پر ہے کہ انسان خود کو پہچانے۔ اپنی روح کی خامیوں کو پرکھے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرے۔ گویا قرآن کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ انسان تزکیہ نفس کرے۔

خود اپنی معرفت

اپنی روح کو یعنی اپنے نفس کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے پہچانا اور پرکھا جائے۔ تہذیب اور تزکیہ دونوں ایک ہی معنی رکھتے

ہیں یعنی پاک کرنا۔ نفس کو برائیوں سے پاک کرنا۔ آدمی کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی حقیقت روح ہے اور وہ ایک دوسرے عالم کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس دنیا میں اسے بھیجا گیا ہے تاکہ وہ دوسرے عالم میں ہمیشہ رہنے کے لئے تیاری کر لے۔ ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ذمہ داریوں کو پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے۔

جب تک انسان میں حیوانیت کی مخصوص صفتیں نمایاں رہیں گی تب تک وہ صحیح معنوں میں انسان نہیں بن سکتا۔ لالچ، کنجوسی، کینہ پروری، منافقت، دوسروں پر برتری کی خواہش اور غیظ و غضب وغیرہ، یہ سب حیوانی خصلتیں ہیں۔ جب تک ایسی خصلتوں کو آدمی دور نہیں کرے گا اپنی حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکے گا۔ مادہ پرست لوگ اور کمیونسٹ افراد انہی حیوانی خصلتوں کی وجہ سے خود کو حیوانات کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور زندگی کی سرحد کو موت تک محدود سمجھتے ہیں۔

ساری کائنات تیرے لئے ہے

الم تروا ان اللہ سخر لکم مافی السموت و مافی الارض (سورۂ لقمان ۳۱: آیت ۲۰) "کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے غرض سب کچھ خدا نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور تمہارا تابع بنا دیا ہے۔"

اسی طرح ارشاد ہے **والانعام خلقھا لکم** (سورۂ نحل ۱۶: آیت ۵) "اور جانوروں کو خدا نے تمہارے لئے خلق کیا ہے۔" حدیث قدسی میں ہے کہ **خلقت الاشیاء لاجلک و خلقتک لاجلی** یعنی "اے میرے بندے، میں نے تمام چیزیں تیرے لئے خلق کی ہیں اور تجھے اپنے لئے خلق کیا ہے۔"

خدا نے انسان کو پوری کائنات پر تصرف کا حق دے دیا ہے اسے تمام مخلوقات پر برتری عطا کر دی ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات سے ممتاز بنایا

ہے۔ یہ سب فضل و کرم اس لئے ہے تاکہ انسان شکر گزاری کرے اور خود کو خدا کے لئے وقف کر دے۔ قرب خدا کی جستجو کرے۔ وہ ابھی نہیں جانتا کہ قرب خدا میں کتنا سکون اور کتنی لذت ہے جب وہ جان لے گا تو اس منزل کی جانب بڑھے گا تب پتہ چلے گا۔ وہ بڑھ کر تو دیکھے۔ **فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین** (سورۂ سجدہ ۳۲: آیت ۱۷) "اس کو تو کوئی جانتا ہی نہیں کہ اس کے لئے کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ڈھکی چھپی رکھی ہے۔"

انسان اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ دیگر حیوانوں کی طرح ہے اور حیوانی حرکتیں ہی اس کی زندگی کا ما حصل ہیں۔ یہ کوتاہ فکر ہے۔ اپنی معرفت نہ ہونے اور اپنی منزلت نہ پہچاننے کے سبب سے ایسی غلط فہمی ہے۔ انسان کو جاننا چاہئے کہ بدن سے ہٹ کر بھی وہ کوئی چیز ہے۔ روح بھی کوئی چیز ہے۔ جس طرح بدن کی بیماریاں ہوتی ہیں اسی طرح روح کی بھی بیماریاں ہوتی ہیں۔ جب تک وہ یہ نہیں جانے گا روحانی بیماریوں کا علاج نہیں کرے گا۔ تہذیب نفس اور تزکیہ نفس پر توجہ نہیں دے گا۔

روح اور بدن

جو چیز احساس رکھتی ہے وہ دراصل روح ہے۔ آنکھ، کان، ناک، زبان، بدن وغیرہ دراصل احساس کے ذرائع ہیں۔ ایسے آلات ہیں جن کے ذریعے روح احساس کا عمل انجام دیتی ہے۔ جب یہ آلات کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو روح احساس سے ناآشنا رہ جاتی ہے۔ اصل صلاحیت روح میں ہے کہ وہ احساس کرے۔ جب روح اور بدن میں جدائی ہو جاتی ہے تو اعضاء و جوارح محسوس کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ کوئی آلہ خود کام کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے کام کیا جاتا ہے۔ جب کام لینے والا ہی نہ ہو تو آلہ بیکار پڑا رہتا ہے۔

اگر گوشت کی بنی ہوئی یہ زبان روح کے بغیر بھی بولنے کی صلاحیت رکھتی تو

گھوڑے گدھے کی زبان میں یہ صلاحیت انسان سے زیادہ ہونی چاہئے تھی اس لئے کہ وہ زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ ایک خاص چربی جیسے مادے سے بنی ہوئی آنکھ میں روح سے قطع نظر خود دیکھنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ اسی طرح نرم و نازک ہڈیوں سے بنے ہوئے ناک کان سونگھنے یا سننے کے قابل خود سے نہیں ہوتے۔ یہ روح ہوتی ہے جو ان آلات سے کام لیتی ہے۔

یہ دو الگ چیزیں ہیں

انسان کہتا ہے: "میں جانتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔" تو یہ "میں" دراصل روح کا دوسرا نام ہے۔ بدن کچھ نہیں جانتا۔ مادی چیز میں جاننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ روح اگر نہ ہو تو بدن ایک مادی چیز سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ درخت کے پتے کچھ نہیں جانتے۔ ہاتھ کی انگلیاں کچھ نہیں جانتیں۔ یہ سر یا پیر کچھ نہیں جانتے۔ بدن کچھ نہیں جانتا۔ تو پھر جانتا کون ہے؟ "میں جانتا ہوں" یعنی روح جانتی ہے۔ ظاہر ہے یہ "میں" بدن اور اعضاء و جوارح سے ہٹ کر کوئی چیز ہے۔ اگر بدن کا کوئی حصہ زخمی ہو جائے، مثلاً ہاتھ زخمی ہو جائے تو خود ہاتھ کو فکر نہیں ہوتی کہ وہ اپنی مرہم پٹی کرائے۔ سر یا پیر کو فکر نہیں ہوتی کہ وہ ہاتھ کی مرہم پٹی کرائے۔ "مجھے فکر ہوتی ہے" پس بدن سے ہٹ کر کوئی چیز ہے انسان میں، جو بدن کو سنبھالے رہتی ہے اور استعمال کرتی ہے۔ ہم اس کو روح نام دیتے ہیں۔

انسان کی صلاحیت

انسان کو خدا نے اتنی صلاحیت دی ہے کہ وہ کائنات اور مخلوقات کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی کے لئے تو خلق ہوا ہے۔ نہ صرف دنیا اور دنیا میں موجود چیزوں کو استعمال کر سکتا ہے بلکہ خلا میں موجود اجرام فلکی پر بھی اپنے تصرف کی کمند ڈال سکتا ہے۔ وہ آج چاند کی حرکات و سکنات سے

اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فلاح دن اتنے بج کر اتنے منٹ اتنے سیکنڈ پر چاند خلا میں کس مقام پر ہوگا۔ وہ آج چوہوں کو خلا میں بھیج رہا ہے تاکہ دو تین دن میں وہ چاند تک پہنچ جائیں۔ وہ سیارہ زہرہ وغیرہ سے بھی باخبر ہے۔ اجرام فلکی کی خصوصیات سے آشنا۔ روئے زمین پر موجود اور سطح زمین کے نیچے پائی جانے والی مخلوقات سے وہ باخبر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سمندر میں کیا کچھ ہے۔ معلومات کا ایک خزانہ آج اس کے پاس ہے۔

ان معلومات سے باخبر کون ہے؟ انسان کا بدن یا اس کی روح؟ ہم نے بیان کیا کہ بدن اور اعضاء و جوارح محض روح کے آلات ہیں جن کی مدد سے روح معلومات حاصل کرتی ہے۔ یہ آلات محض مادہ (MATTER) ہیں اور مادہ جاننے یا نہ جاننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ مثلاً تھرمامیٹر بخار کا اندازہ لگانے کے لئے ایک آلہ ہے۔ اب مثلاً ڈاکٹر تھرمامیٹر کے ذریعے یہ جان لیتا ہے کہ مریض کو بخار ہے اور اتنا بخار ہے تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ ڈاکٹر اور تھرمامیٹر دونوں جان گئے ہیں کہ مریض کو بخار ہے اور اتنا بخار ہے۔ لہٰذا کوئی یہ بھی نہیں سکتا کہ روح اور بدن کا مجموعہ یہ انسان فلاں بات جان گیا ہے اور محض روح بے جان بدن کی طرح کچھ نہیں جان سکتی۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ انسان جان گیا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اس کی روح جان گئی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بدن کے بغیر اس کی جاننے والی صلاحیت استعمال میں نہیں آتی۔

موت آتی ہے تو بدن ذرہ ذرہ ہو کر بکھرنے لگتا ہے۔ روح بدن سے نکل جاتی ہے تو وہ دراصل بدن کی موت ہوتی ہے۔ روح فنا نہیں ہوتی۔ معصومؑ کا ارشاد ہے کہ **خلقتم للبقاء لا للفناء** "تم تو باقی رہنے کے لئے خلق کئے گئے ہو، فنا ہو جانے کے لئے نہیں!"۔

بدن سواری ہے اور روح اس کا سوار ہے۔ موت آتی ہے تو سوار سواری

سے بس اتر جاتا ہے۔ منزل نزدیک جو آجاتی ہے۔ اس لئے پیدل ہی منزل کی طرف جانے لگتا ہے۔ معصوم امامؑ فرماتے ہیں کہ "موت کی وجہ سے روح کا لباس بدل جاتا ہے"۔ پہلے روح نے مادی لباس پہنا تھا جو وزنی تھا اور زحمت کا باعث بنا ہوا تھا۔ پھر روح سے وہ لباس اتار لیا جاتا ہے اور اسے غیر مادی اور ہلکا پھلکا لباس دے دیا جاتا ہے جسے علم کلام کی اصطلاح میں "بدن مثالی" یا "بدن برزخی" کہتے ہیں۔ امام معصومؑ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ "موت آتی ہے تو جیسے پنجرے کا دروازہ کھل جاتا ہے اور پرندہ (روح) پنجرے (بدن) سے نکل کر اڑ جاتا ہے۔" پھر اس کی رسائی عالم ارواح تک بھی ہو جاتی ہے جو بہت وسیع ہے۔

خود کو بھی فراموش کر بیٹھے

جو لوگ خود کو حیوانوں کی صف میں شامل کرتے ہیں اور بدترین قسم کا حیوان خود کو شمار کرتے ہیں وہ واقعی حیوان ہیں۔ بلکہ حیوانوں سے بدتر ہیں۔ عقل و شعور رکھتے ہوئے بے عقلی کو خود پر طاری کرتے ہیں۔ اپنے خدا اور اپنے فرائض کو نظرانداز کئے رہتے ہیں۔ خود کو حیوان سمجھتے ہوئے حیوانوں کی سی حرکتوں ہی کو اہمیت دیتے ہیں اور ان حرکتوں میں مست نظر آتے ہیں۔ شہوت کا پیٹ بھرنے اور حیوانی خواہشات بے لگامی کے ساتھ پوری کرنے کے سوا ان کو اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے خدا کو فراموش کر دیا ہے اور اس کے نتیجے میں خدا نے ان کو دنیاوی سزا یہ دی ہے کہ وہ خود کو اور اپنی حیثیت و حقیقت کو بھی فراموش کر بیٹھے ہیں۔ **نسوا اللہ فانساھم انفسھم** (سورۂ حشر ۵۹ : آیت ۱۹)۔ انہیں چاہئے کہ وہ انسانیت کا جامہ تلاش کر کے پہن لیں۔ حیوانیت کی برہنگی ترک کر دیں۔ اپنے منصب اور اپنی حیثیت کو پہچانیں۔ کیمونسٹ نظریئے پر نظر ثانی کریں اور پسِ پشت ڈال دیں۔ صرف اس دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ نہ سمجھیں۔ دنیا کو سب

سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی عیش و عشرت، جاہ و اقتدار، خود پرستی یعنی اپنے من کی پوجا، غنڈہ گردی، بے راہ روی، ظلم و جبر، قتل و غارت، غرض ہر ایسی صفت کو اپنا لیتا ہے جو اسے مزید گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس طرح وہ مزید گمراہی کی دلدل میں دھنسا چلا جاتا ہے۔ اور حیوانوں سے بدتر زندگی گزار کر آخر کار مر جاتا ہے۔

آدمی دیکھے کہ کیا وہ کوئی جانور ہے! ظاہر ہے انسان، جانور سے بہت ممتاز ہے۔ ہر لحاظ سے ممتاز ہے۔ پھر خود کو جانور قرار تو نہ دے۔ اپنی توہین خود تو نہ کرے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی انسان کی روح کسی جانور میں سما گئی ہو یا کسی جانور کی روح کسی انسانی بدن میں آگئی ہو۔ یہ "تناسخ" کا عقیدہ کہلاتا ہے اور کفر کی طرح غلط طرز فکر ہے۔ غلط ہے جو کہتے ہیں کہ خراب آدمی جب مرتا ہے تو اس کی روح کسی دوسرے خراب آدمی کے بدن میں آجاتی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ کسی کی روح دوسرے کے بدن میں نہیں جاتی۔ اسلام ان خرافات کا سخت مخالف ہے۔

بہشت کے جوان

قیامت نہ صرف آیات و روایات سے ثابت ہے بلکہ یہ بات عقل سے بھی ثابت کی جا سکتی ہے کہ قیامت کا ہونا ضروری ہے۔ البتہ عقل سے دیگر چھوٹی چھوٹی جزوی باتیں ثابت نہیں کی جا سکتیں۔ ان کے ثبوت کا ذریعہ آیات و روایات ہی پر منحصر ہے۔ سوال کیا گیا ہے کہ روز قیامت ہم کتنے سال کے لگ رہے ہوں گے؟ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام جنتی لوگ جوانی کے عالم میں محشور ہوں گے۔ مرد بتیس سال کے لگ رہے ہوں گے اور عورتیں سولہ سال کی معلوم ہو رہی ہوں گی۔ یہ جنتی لوگ ہمیشہ اسی عمر کے محسوس ہوتے رہیں گے۔ جنت میں کوئی بوڑھا نہیں ہو گا۔ بڑھاپے کا وہاں کیا کام۔ اس عالم کا اس عالم سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرد اگر بتیس سال کا ہو تو اس کی جوانی بھرپور ہوتی ہے اسی طرح عورت اگر سولہ سال کی ہو تو بھرپور جوان شمار ہوتی ہے۔

ایک اور سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ ہماری شکل و صورت محشر میں کیسی ہو گی؟ اس کا بھی جواب ہم آیتوں اور روایتوں کی روشنی میں دیں گے۔

وہاں سیرت کے مطابق صورت ہو گی

سورۂ نباء کی آیت نمبر اٹھارہ میں ارشاد ہوا: **یوم ینفخ فی الصور فتاتون افواجا** "جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم لوگ گروہ گروہ حاضر ہو جاؤ گے۔"

تفسیر قمی میں اس آیت کے ذیل میں تحریر کیا گیا ہے کہ رسول خداؐ کے پاس آکر ایک شخص نے سوال کیا "یہ آیت کافروں کے بارے میں ہے یا مسلمانوں کے؟"

آنخضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمانوں کے بارے میں ہے۔ مسلمان گروہ گروہ کرکے میدان حشر میں آئیں گے۔ دس قسم کے گروہ ہوں گے۔ بعض کی شکل بندروں جیسی ہو گی۔ کسی گروہ میں جو لوگ ہوں گے وہ خنزیر کی صورت والے ہوں گے۔ ایک گروہ ایسا بھی ہو گا جن کا چہرہ ان کی پشت کی طرف مڑا ہوا ہو گا۔ ایک گروہ کے لوگ اندھے ہوں گے۔ ایک گروہ میں ایسے لوگ ہوں گے جو خود اپنی زبان چبا رہے ہوں گے اور ان کی زبان سے پیپ نکل رہی ہو گی۔۔۔۔" (اس حدیث کا عربی متن آیت اللہ دستغیب کی کتاب معاد میں ترجمہ اور تشریح کے ساتھ تحریر ہے۔ وہاں ملاحظہ کیجئے۔)

"البتہ ایک گروہ ایسا بھی ہو گا جس میں شامل لوگوں کی صورت چودھویں کے چاند کی طرح نورانی ہو گی اور فرشتوں کی طرح گناہوں سے پاک لگ رہے ہوں گے۔ میدان حشر میں سب سے اونچی جگہ ان کا گروہ چل رہا ہو گا۔"

ایک اور حدیث نبویؐ میں جنتی عورت کے حسن و جمال کا تذکرہ کچھ یوں ملتا ہے کہ:

"جنّتی عورت کا حسن و جمال حُورالعین 'یعنی بڑی بڑی آنکھوں والی سب سے خوبصورت حور کے مقابلے میں زیادہ ہو گا۔ اتنا ہی زیادہ ہو گا جتنا حورالعین کا حسن و جمال عام حوروں کی نسبت ہوتا ہے۔" (بحار الانوار جلد نمبر ۳)

خلاصہ یہ کہ وہاں سیرت کے مطابق صورت ہو گی۔ جس کی سیرت فرشتوں جیسی ہو گی اس کا چہرہ بھی محشر میں فرشتوں کی طرح معصومانہ اور نورانی ہو گا۔ لیکن اگر دنیا میں آدمی جانور بنا رہا تو محشر میں اس کی شکل و صورت بھی جانوروں کی سی ہو گی۔ بلکہ بدصورت جانوروں سے بدتر ہو گی۔ **یحشر الناس علی صور تحسن عندھا القردۃ والخنازیر** "بعض لوگ ایسی صورتوں کے ساتھ محشور ہوں گے کہ ان کے مقابلے میں بندروں اور خنزیروں کی شکل اچھی لگے گی!" وہ اتنے بدصورت ہوں گے کہ اپنے جیسے لوگوں کو دیکھ کر وحشت کے مارے آرزو کریں گے کہ جلد ان کو جہنم میں جھونک دیا جائے تاکہ وہ ایسی شکلیں تو نہ دیکھیں!!

کتا دانت سے کاٹتا ہے اور بعض لوگ زبان یا قلم کے ذریعے گزند پہنچاتے ہیں۔ کسی کی عزت اچھالتے ہیں تو کسی کا دل توڑتے ہیں۔ کتا تو ایسے کام نہیں کرتا۔ پس ایسے لوگوں کی شکل محشر میں کتے سے بدتر نہ ہو تو کیسی ہو! خداوند تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہماری سیرت اچھی بنا دے اور اچھی رکھے تاکہ محشر میں ہماری شکل اچھی نظر آئے۔

روح محور ہے

ایک اور سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ ہم نے جوانی میں کچھ گناہ کئے۔ اب کیا یہ عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ مرنے کے بعد بوڑھے بدن کو ان گناہوں کی سزا دی جائے؟

میں نے عرض کیا ہے کہ اصل کام کروانے والی چیز روح ہوتی ہے اور بدن روح کے اشارے پر مختلف کام کرتا ہے۔ گویا روح بدن کے آلات استعمال

کرتی ہے۔ پس سزا بدن یا آلات کو نہیں ملتی۔ اصل سزا روح کو ملتی ہے۔ بدن
بوڑھا ہو یا جوان' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ روح تو وہی رہتی ہے۔ سینکڑوں
سال پرانی روح اور بیس سال کی روح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ خدا گوشت
پوست کو سزا نہیں دیتا بلکہ سزا کی اذیت روح کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اگر
بظاہر گوشت پوست کو کاٹا جائے یا جلایا جائے تو وہ محض مادی آلہ ہے۔ اور
مادے کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جزا اور سزا کا محور روح
ہے۔

دنیا کا عذاب

اور جہاں تک سزا کا تعلق ہے ایک سزا وہ ہوتی ہے جو دنیا میں مجرم قرار
پانے والوں کو دی جاتی ہے۔ مثلاً انہیں جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دنیا والے
جو سزا دیتے ہیں ہو سکتا ہے وہ خود ظلم ہو۔ مثلاً شاہ کے زمانے میں سیاسی قیدیوں
کے ناخن اکھاڑ لئے جاتے تھے! اور ایک سزا وہ ہوتی ہے جو خدا دیتا ہے۔ خدا
جو سزا دیتا ہے اسے عذاب کہتے ہیں اور وہ ہرگز ظلم نہیں ہوتا بلکہ عدل کے
عین مطابق ہوتا ہے۔ خدا اپنے بعض مجرموں یعنی گناہگاروں کو عدل کے عین
مطابق کبھی دنیا میں سزا دیتا ہے اور بعض گناہگار ایسے ہوتے ہیں جو آخرت کا
عذاب چکھتے ہیں۔ دنیا والے سخت سے سخت سزا بھی دے دیں یا دنیا میں خدا
سخت سے سخت عذاب بھی نازل کرے تب بھی اس کا موازنہ آخرت کے
عذاب سے نہیں کیا جا سکتا۔ آخرت کا معمولی عذاب بھی اتنا سخت ہوتا ہے کہ
ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ **فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ**
(سورۂ بقرہ ۲ آیت ۲۴) یعنی "اے لوگو! تم اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن
انسانوں اور پتھروں پر مشتمل ہوگا!"

البتہ عذاب کیسا ہوگا' اس کی تفصیلات جاننا ضروریات مذہب میں سے
نہیں۔ یہ سب تفصیل سے جاننا اور ان تفصیلات پر اعتقاد رکھنا واجب نہیں

ہے۔

ہاں تو ہم سوال کا جواب دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ سزا روح کو خدا دیتا
ہے اور سزا کا تعلق بنیادی طور پر بدن سے نہیں ہے۔ بدن تو زندگی ہی میں رفتہ
رفتہ گھلتا اور اپنی صلاحیتیں کھوتا رہتا ہے۔ ہر چالیس دن کے اندر اندر بدن
میں موجود خلئے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بیٹری کے سیل کی طرح گوشت میں موجود
خلئے بھی کام کرتے کرتے اتنے ناکارہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی جگہ خداوند عالم
دوسرے خلئے بدن میں خلق فرما دیتا ہے جو پرانے خلیوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔
ان خلیوں کے اعتبار سے آج ہمارا بدن وہ نہیں ہے جو پچھلے سال تھا۔ تمام خلئے
باری باری تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے اول تو سزا بدن کو
نہیں روح کو دی جاتی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ نہیں بدن کو بھی دی جاتی ہے تو
جواب دیا جا سکتا ہے جو خلئے آلۂ جرم قرار ہی نہ پائے ان کو سزا دینا تو کجا سزا کے
کیس میں شامل کرنا بھی معقول نہیں ہے۔

دنیا ہی میں ترقی کی فکر ہونی چاہئے

ایک اور سوال پوچھا گیا ہے کہ اس دنیا میں درجات بلند ہوتے رہنے کے
امکانات ہیں یا نہیں؟ یہ خدا کا بنایا ہوا ایک عام اصول ہے کہ دنیا عمل کے لئے
ہے اور موت کے بعد نامہ اعمال بند ہو جاتا ہے۔ رسول خدا ؐ سے منقول ہے کہ
الدنیا مزرعۃ الاخرۃ۔ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔" یعنی آدمی جو کچھ بوتا ہے
وہ دنیا میں بوئے تاکہ اسے آخرت میں کاٹے۔ اگر آخرت میں درجات بلند
ہوتے رہنے سے یہ مراد ہے کہ اس بلندی کے سلسلے میں دنیا میں کچھ نہ کیا گیا ہو
تو یہ درست نہیں ہے۔ یہ توقع غلط ہے کہ ایک بے نماز آدمی دنیا سے گزر جائے
اور آخرت میں نمازی آدمی کا درجہ چاہے۔ البتہ بے نماز آدمی جو مر چکا ہو اس
کے لئے ایصال ثواب کے طور پر اگر دوسرے لوگ کچھ کار خیر انجام دیں یا اس
کی نیابت میں نماز پڑھ لیں تو مرحوم کو اس کا ایک حد تک فائدہ حاصل ہو سکتا

ہے۔ لیکن وہ فائدہ اتنا نہیں ہوتا جتنا خود اس کے دنیا میں عمل کر کے جانے سے ملتا۔ بہرحال خدا کے فضل و کرم اور شفاعت کے دروازے ممکن ہے اس کے لئے کھل جائیں۔ البتہ یہ بات صرف امکان کی حد تک ہے۔ اگر کوئی شخص یقینی طور پر نجات چاہتا ہے تو اسے دنیا ہی میں اپنے عمل پر اور واجبات پر توجہ دینی چاہئے۔

رحم کی توقع کب مناسب ہے؟

لوگ کہتے رہتے ہیں: "خدایا! ہم پر رحم کر۔" لیکن وہ خود اپنے اوپر رحم نہیں کرتے۔ اپنے اوپر گناہوں کا بوجھ بڑھاتے ہی رہتے ہیں۔ اپنے لئے عذاب کا سامان اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں: "خدایا! ہم پر رحم کر۔" کیا اس طرح رحم کی توقع رکھنا معقول ہے؟! ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور صلح صفائی کا نام تک نہیں لیتے۔ نہ خود معافی مانگتے ہیں نہ دوسروں کو معاف کرتے ہیں۔ مگر خدا سے معافی مانگتے ہیں۔ خدا تو اس وقت تک معاف نہیں کرتا ہے جب تک بندے معاف نہ کر دیں! **و لیعفوا الا تحبون ان یعفو اللہ لکم** (سورۂ نور ۲۴: آیت ۲۲) "لوگوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے کی خطا معاف کر دیں اور در گزر سے کام لیں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ خدا تمہاری خطا معاف کرے۔" اگر آپ کا قرضدار فی الوقت آپ کی رقم لوٹا نہیں سکتا ہے تو آپ کو چاہئے کہ اسے کچھ مہلت دیں۔ ہو سکتا ہے اس کے نتیجے میں خدا آپ کو کچھ مہلت دے۔

فرمودۂ سید الساجدینؑ

سید ابن طاؤس کی کتاب "اقبال" میں لکھا ہے کہ جب عید الفطر ہوتی تھی تو امام زین العابدین علیہ السلام اپنے غلاموں اور کنیزوں کو اکٹھا کر لیتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو گزشتہ سال بھر میں ہونے والی غلطیوں سے آگاہ کرتے

تھے۔ پھر فرماتے تھے "آج کا دن ہے میں نے تم سب کو معاف کر دیا اور آزاد کر دیا۔ تم لوگ بھی بس یہ کہہ دو کہ خدایا، علیؑ ابن الحسینؑ نے ہم کو معاف کر دیا۔ تو بھی اس کی خطاؤں سے درگزر فرما۔ اس نے ہمیں آزاد کر دیا۔ تو بھی اسے دوزخ کی آگ سے آزاد قرار دے!"

آخرت کی منزل بہت کٹھن ہوتی ہے۔ اس دنیا کے بعد والے مراحل بہت سخت ہوتے ہیں۔ وہاں کے لئے ٹھوس انتظامات بہت ضروری ہیں۔ عمل کی بنیاد کے بغیر خدا کے رحم و کرم کی امید رکھنا مناسب نہیں ہے۔ جو کچھ آپ خدا سے چاہ رہے ہیں خود آپ کو بھی اس کا ایک نمونہ بننا چاہئے۔ اگر آپ خدا سے رحم کی توقع رکھتے ہیں تو دوسروں کے ساتھ بھی رحم سے کام لیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ خدا آپ کو معاف کر دے تو آپ کو بھی چاہئے کہ آپ دوسروں کو معاف کر دیں۔ اگر آپ دوسروں سے انتقام لینے کی فکر میں ہیں تو خدا سے اپنی معافی کی توقع رکھنا بیجا ہے۔

ایک سوال پوچھا گیا تھا کہ آخرت میں درجات بلند ہوتے رہتے ہیں یا نہیں، اس سلسلے میں ایک بات رہ گئی ہے۔ اگر آدمی جنتی ہے اور قرب خدا کا حقدار ہے تب بھی اس کے درجات بلند ہوتے رہنا ممکن ہیں۔ قرب خدا کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حاصل ہونے والی خوشی اور مسرت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ پس جنت میں مومنین اور معصومینؑ کے درجات خدا کے فضل و کرم سے بڑھتے رہتے ہیں۔ ایک آدمی زندگی بھر محمدؐ و آل محمدؐ سے محبت رکھتا آیا ہو اور اس محبت کی چاشنی سے آشنا ہو تو دنیا سے گزر جانے کے بعد یقیناً یہ محبت بڑھ جاتی ہے اور اس کا لطف بھی کہیں زیادہ ہو جاتا ہے۔

جمہوری اسلامی ایران

متعدد روایات میں ہے کہ جب امام زمانہ علیہ السلام آئیں گے تو دنیا ظلم و جور سے بھری ہوگی، اور وہ اس دنیا کو عدل و انصاف سے ایسے ہی بھر دیں گے

جیسے وہ ظلم و جور سے بھری ہوئی تھی۔ **یملا الارض قسطا و عدلا کما ملئت ظلما و جورا۔**

یہاں سے ایک مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ امام زمانہؑ کے ظہور کے لئے ایسے حالات ہونے چاہئیں کہ دنیا ظلم و جور سے بھری ہوئی ہو۔ روایات کی روشنی میں ظہور کی یہی علامت ہے کہ دنیا ظلم و جور سے بھری ہوئی ہو۔ پس خوب ظلم کرنا چاہئے اور بے لگام ہو جانا چاہئے تاکہ امام زمانہؑ ظاہر ہوں!

ایسی غلط فہمی پھیلانے والے لوگ اسلامی جمہوریہ ایران پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ حکومت تو ایران میں عدل و انصاف پھیلا رہی ہے اور یہ ظہور امام زمانہؑ کی راہ میں نعوذ باللہ رکاوٹ ہے! ابھی ہم اس غلط فہمی کا جواب دیں گے۔

اختیار

امام زمانہؑ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تلوار یا بندوق کے زور پر لوگوں کو مومن یا عادل بنائیں گے۔ اسلحے کے بل پر حکومتوں کو تو شکست دی جا سکتی ہے مگر دلوں پر حکومت نہیں کی جا سکتی۔ ایمان اور عدل و انصاف اختیاری چیزیں ہیں۔ تلوار کے زور پر اگر کوئی مومن بن جائے تو وہ مومن نہیں ہے۔ اسلحے سے ڈر کر اگر کوئی شخص انصاف اختیار کرے تو وہ عادل نہیں کہلائے گا۔ ظلم کی ضد عدل ہے۔ اگر کوئی شخص ریوالور دکھا کر مجبور کر دیا جائے کہ وہ کسی پر ظلم کرے تو وہ شخص ظالم نہیں کہلائے گا۔ ظلم بھی عدل کی طرح ایک اختیاری شئے ہے۔ کسی سے ڈر کر آدمی مجبوراً نماز پڑھے تو اس نماز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چوپائے ہمیشہ رکوع کی حالت میں ہیں۔ کیڑے مکوڑے ہمیشہ سجدہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو ایسے رکوع یا سجدے کا کوئی ثواب نہیں ہوتا۔ ثواب یا عذاب اختیاری کاموں پر

ہوتا ہے۔ غلط فہمی کی بنیاد یہیں پر ہے۔ **ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعا** (سورۂ یونس ۱۰: آیت ۹۹) "اے رسولؐ اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔"

عدالت

امام زمانہؑ جب ظاہر ہوں گے تو عدل و انصاف رفتہ رفتہ دنیا میں پھیلائیں گے۔ لوگوں کو پہلے اس قابل بنانے کی کوشش کریں گے کہ وہ ذہنی طور پر عدل و انصاف قبول کر سکیں۔ پھر حکومت عدل قائم کرنے کے اقدامات فرمائیں گے۔ ملتوں میں انقلاب ایک دم برپا نہیں ہو جاتا بلکہ رفتہ رفتہ لوگوں کو اس کے لئے آمادہ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام زور اور زبردستی سے نہیں ہوتا بلکہ عقل و شعور میں اور دل میں ڈالنے سے ہوتا ہے۔ امام زمانہؑ دلوں میں بات ڈالنے کا یہ کام بتدریج کریں گے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں **اذا قام قائمنا وضع اللہ یدہ علی رؤس العباد فجمع بھا عقولھم و کملت بہ احلامھم** (اصول کافی، باب عقل، حدیث ۲۱) "جب ہمارا قائم عدل پھیلانے کے لئے قیام کرے گا تو خدا اپنے بندوں کو اس کی دسترس میں دے دے گا۔ پس وہ اس پیار بھری دسترس کے ذریعے لوگوں کی عقلوں اور فکروں کو ہم آہنگ کرے گا۔ اور اس طرح ان کا شعور پختہ ہو جائے گا۔"

ایران کا اسلامی انقلاب بے شک حضرت مہدیؑ کے ظہور کی راہ ہموار کرتا ہے۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ ظہور کے وقت پوری دنیا، دنیا کی تمام قومیں اور دنیا کے تمام افراد گمراہ ہو چکے ہوں گے۔ ایسا نہیں ہوگا کوئی نہ کوئی قوم عدل کی راہ پر گامزن بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے ان احادیث کی نفی نہیں ہوتی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا ظلم و جور سے بھری ہوگی۔ استثناء کا ہر موضوع میں عقلی طور پر امکان موجود ہوتا ہے۔

ملت ایران رفتہ رفتہ ہی سمجھ پائی ہے کہ پہلوی حکومت غلط بنیادوں پر قائم ہے اور نامناسب کام کر رہی ہے۔ رفتہ رفتہ ہی قوم میں اتحاد پیدا ہوا ہے اور ایک رہبر کی رہبری میں لوگ آگے بڑھے ہیں۔ قوم عقل شعور کے اعتبار سے رفتہ رفتہ ہی بلندی اور پختگی کو حاصل کر سکی ہے۔ اگر شعور میں یہ پختگی نہ ہوتی اور پیدا نہ کی جاتی' بلکہ وقتی طور پر جذبات ابھار کر تختہ الٹ دیا جاتا تو آج شاہی حکومت دوبارہ آ چکی ہوتی۔ یہ شعور ملت کی پختگی ہے کہ شاہی حکومت کے دوبارہ قیام کی راہ بند ہو چکی ہے۔

آج منحرف لوگ علماء کے خلاف جسارت کر رہے ہیں۔ انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اشیائے صرف کی کمی کا ذمہ دار علماء کو قرار دے رہے ہیں۔ ان کی سازش امام خمینی کی ایک تقریر سے ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ملت کا شعور پختہ ہو چکا ہے اور ملت بیدار ہو چکی ہے۔

ظلم' عدل سے ڈرتا ہے

امام خمینی نے درست فرمایا ہے کہ "جو کوئی بھی ملت کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے' امریکہ سے وابستہ ایجنٹ اسی کو اپنی مذمت کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔" ملت ایران اس حقیقت سے باخبر ہو چکی ہے۔ ملت عدل و انصاف کو مکمل طور پر قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ امام زمانہؑ کی راہ ہموار کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ جب تک لوگوں میں اور عوام میں عقل و شعور پختہ نہ ہو ایسی آمادگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک عوام میں ایسی آمادگی پیدا نہ ہو اس وقت تک عادلانہ حکومت کے قیام کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ یہ معاشرے کے افراد ہی ہوتے ہیں جو حکومت کے مشن کو کامیاب یا ناکام بنا دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ نہ صرف ہماری ملت کا شعور بیدار ہو چکا ہے بلکہ پڑوسی ممالک اور مسلم ممالک میں بھی ملتیں رفتہ رفتہ بیدار ہو رہی ہیں۔ سپر

طاقتوں کو ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں انقلاب دیگر ممالک میں بھی بپا نہ ہو جائے اور کہیں ان کے مفت خوری کے مذموم مقاصد کی راہ میں مزید رکاوٹیں کھڑی نہ ہو جائیں۔

جی ہاں' ظالم طاقتیں ڈر رہی ہیں کہ کہیں دنیا میں عدل پھیل نہ جائے۔ ظلم' عدل سے ڈرتا ہے اور ڈر رہا ہے۔ بس یہ عوام کے عقل و شعور کی پختگی ہے جس کی وجہ سے سپر طاقتوں کو واپس ایران میں اپنے قدم جمانے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔

☆☆......☆☆......☆☆

چوتھا درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان کا سراپا

خدا کا حکم ہے کہ انسان خود اپنی خلقت پر غور کرے۔ پانی کا ایک قطرہ قدرت خدا سے بدن کے ایک عظیم کارخانے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ہڈیوں کا ایک جال سا بدن میں بچھا ہے اور ہر ہڈی اپنی جگہ انتہائی مناسب ہے۔ کہتے ہیں کہ ہاتھ کے پنجے میں چونتیس ہڈیاں ہوتی ہیں۔ اگر اتنی ہڈیاں نہ ہوں تو آدمی سخت مشکل کا شکار ہو جائے۔ مٹھی بند کرنا' کوئی چیز اٹھانا' انگلیاں پھیلانا یا سمیٹنا دشوار ہو جائے۔ ہر ہر عضو میں خدا کی حکمت نظر آتی ہے۔ کوئی رگ اور کوئی ہڈی نہ کم ہے اور نہ زیادہ۔ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ جسم کا کوئی عضو بے فائدہ ہے۔

اپینڈکس

تقریباً تیس چالیس سال پہلے ڈاکٹر کہا کرتے تھے کہ جسم میں ایک عضو زیادہ ہے۔ اپنڈکس کی آنت کو وہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔ انگلی بھر لمبا وہ ایک آنت کا ٹکڑا ہے جس میں غذا جاتی ہے تو اسے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ غذا جاکر پلٹ آتی ہے اور اس کے کچھ ذرات وہیں رہ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں تعفن اور بدبو کا امکان رہتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ کسی نہ کسی بیماری کا سبب بنتا ہے۔ اسی لئے یہ امیر لوگوں کی رسم بن گئی تھی کہ صحت مند ہوتے ہوئے بھی وہ آپریشن کروا لیتے تھے اور اپنڈکس کی آنت نکلوا دیتے تھے۔

لیکن آج مزید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تیس چالیس سال پہلے کے ڈاکٹروں نے غلط کہا تھا۔ آنت کا یہ ٹکڑا اضافی نہیں ہے بلکہ ایک اہم کام انجام دیتا ہے۔ گویا خطرے کی گھنٹی بن جاتا ہے۔ جب بھی معدے کی آنتوں

میں تعفّن کی ابتداء ہوتی ہے تو اپنڈکس کی آنت میں درد ہونے لگتا ہے۔ اس درد کا علاج کرنے کے لئے آدمی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور مرض پر ابتدائی مرحلے میں قابو پا لیا جاتا ہے۔ اگر اپنڈکس کی آنت نہ ہو تو پورا معدہ تعفن کا شکار ہو جائے اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر مرض کا علاج آج کے ڈاکٹروں کے بس میں نہیں رہتا۔

درد کا احساس

درد کا احساس انسان کے لئے نعمت ہے۔ درد محسوس ہوتا ہے تو آدمی علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا ہے اور مرض خدا کے فضل و کرم سے قابو میں آ جاتا ہے۔ اگر درد نہ ہو تو آدمی دوا کی فکر ہی نہ کرے اور جسم میں بیماری اندر ہی اندر پھیلتی چلی جائے۔ یہ درد ہے جو الارم کی طرح بروقت بتا دیتا ہے کہ خطرہ سر پر ہے۔ اس طرح ڈاکٹر گویا بیماری کے مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے اور اس پر خدا کے فضل سے قابو پا لیتا ہے۔ سرطان کا مرض اتنا خطرناک ہے کہ اگر بڑھ جائے تو جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن درد کا احساس ہوتے ہی علاج شروع کر دیا جائے تو اس پر قابو پانا ممکن ہو جاتا ہے۔

شیخ بو علی سینا کے بقول "جو شخص علم ہیئت یعنی ستاروں کے علم اور علم تشریح یعنی جسم کی اندرونی ساخت کے علم سے ناواقف ہو وہ ٹھوس طریقے سے خدا کو بھی پہچان نہیں سکتا۔" بعض لوگ بو علی سینا کے اس قول کو حضرت امام علی رضاؑ سے منسوب کرتے ہیں اور اس کی عبارت عربی میں کچھ یوں پیش کرتے ہیں: **من لم یعرف الھیئۃ و التشریح فھو عنین فی معرفۃ اللہ۔** بہرحال اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ آدمی جتنا زیادہ اعضائے بدن کی حکمتوں اور اجرام فلکی کی حرکتوں پر غور کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ قدرت خدا کا قائل ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی زیادہ خدا کی حکمتیں اسے متاثر کریں گی۔ اور وہ بے اختیار کہے گا کہ یہ سب کچھ اتفاق سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے جو

بڑی حکمتوں والا ہے۔

فطرت کا انتخاب

مادہ پرست لوگ کیسی نامعقول بات کرتے ہیں کہ فطرت یا نیچر نے چاہا کہ وہ ایسے انسانی بدن کی صورت اختیار کرے اور اس طرح کائنات کا روپ دھار لے۔ حالانکہ وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ فطرت یا نیچر مادے ہی پر مشتمل ہوتی ہے اور اس میں عقل و شعور اور سمجھنے یا کچھ چاہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ پس یہ کتنی نامعقول بات ہے کہ ایک طرف کہا جائے کہ نیچر میں کچھ چاہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی دوسری طرف کہا جائے کہ نیچر نے کچھ چاہا! جب فطرت یا نیچر خود عقل نہیں رکھتی تو بھلا کیسے وہ عقل رکھنے والے انسانوں کی شکل میں آ سکتی ہے!! قطرہ بھر نطفے میں جب شعور نہیں ہے تو بدن کے حکمتوں بھرے اتنے عظیم لیکن مختصر کارخانے کا روپ وہ کیسے دھار سکتا ہے! فطرت یا نیچر جب محض مادے سے بڑھ کر نہیں ہے تو اسے کوئی دوسری شکل میں آنے کا انتخاب و اختیار بھلا کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ مادے میں انتخاب و اختیار کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔

آنکھوں اور پلکوں ہی پر غور کر لیجئے۔ چھوٹے چھوٹے بال اوپر اور نیچے کے دونوں پپوٹوں پر سلیقے سے اگے ہوئے ہیں۔ اتنے مناسب انداز میں اگے ہوتے ہیں کہ اوپر کا پپوٹا جب نیچے ملتا ہے تو اوپر اور نیچے کے بال آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔ کچھ اس انداز اور زاویئے سے اگے ہوتے ہیں کہ مٹی کے ذروں اور ہوا میں اڑتی ہوئی دیگر چھوٹی چیزوں کے خلاف ڈھال کا کام دیتے ہیں اور آنکھ میں انہیں پہنچنے سے روکتے ہیں۔ عقل سے بیدل فطرت میں اتنی صلاحیت کہاں کہ وہ یہ سب خیال رکھے!

خلئے

بیالوجی کے علم نے اب تک بہت ترقی کر لی ہے پھر بھی تحقیقات کا ایک قافلہ ہے جو چلا آرہا ہے اور اپنے ساتھ نئی نئی معلومات لا رہا ہے۔ آج بھی سائنس داں کہتے ہیں کہ اعضائے بدن کی بہت سی حکمتیں اب تک ہمیں معلوم نہیں ہوئی ہیں اور ممکن ہے کہ بعد میں معلوم ہو جائیں۔

انسان کے بدن میں بے شمار خلئے (CELLS) ہوتے ہیں۔ ایک کان ہی کو لے لیجئے۔ اس میں ٣٠ لاکھ ایسے ذرات ہوتے ہیں جن کو خلیئے کہا جاتا ہے۔ اگر یہ خلیئے نہ ہوں تو آدمی کو کچھ سنائی نہ دے۔ ہمارے ایک عزیز میں سننے کی صلاحیت نہیں تھی۔ انتہائی دقیق معائنے کرانے پڑے تو یہ نتیجہ نکلا کہ ٣٠ لاکھ میں سے ١٦ ہزار خلیئے کان میں نہیں ہیں اسی لئے سماعت کی قوت بھی نہیں ہے!

شیخ بوعلی سینا کا یہ قول ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک لوہار کو کام کرتے دیکھ کر لوگ تعجب کرتے ہیں۔ وہ لوہے کے ایک ٹکڑے کو پگھلا لیتا ہے اور سلاخ کی شکل میں لمبا کر دیتا ہے۔ اتنی سی بات پر لوگ حیرت کرتے ہیں لیکن وہ یہ غور نہیں کرتے کہ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کی میت چار آدمی بھی ذرا مشکل ہی سے اٹھا پاتے ہیں۔ جب تک روح اس کے بدن میں تھی وہ محض ارادے کے ساتھ ہی چل پڑتا تھا بلکہ آسانی سے بھاگ دوڑ بھی سکتا تھا۔ آخر یہ روح کتنی طاقتور ہے اور کہاں سے آئی ہے' اس پر لوگ نہ تو غور کرتے ہیں اور نہ ہی تعجب۔ واقعاً" خدا نے روح کو کتنی طاقت دی ہے!

خدا کے احسانات

ہم جتنا غور کریں گے خدا کے احسانات اتنے ہی زیادہ ہم پر آشکار ہوں گے۔ عقل کہے گی کہ ایسا خالق واقعاً" شکر گزاری اور اطاعت کے لائق ہے۔ دل بھی کہے گا کہ واقعاً" اتنے دانا اور توانا خالق کے سامنے سجدہ ریز ہو کر رہنا

چاہئے اور اس کے حکم کے خلاف سر نہیں اٹھانا چاہئے۔

بزرگوں نے کہا ہے اور درست کہا ہے کہ **الانسان عبد الاحسان** "انسان تو احسان کو بندہ ہوتا ہے۔" اپنے محسن کا ممنون ہونا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ فطری طور پر محسن کے آگے سر جھک جاتا ہے۔ لہٰذا انسان اپنی فطرت کے خلاف کام نہ کرے۔ خدا سے بڑھ کر اور کون محسن ہوگا۔ خدا کے احسانات سے بڑھ کر اور کس کے احسانات ہوں گے!

زوال نعمت سے پہلے

چند سال پہلے کی بات ہے کہ میرے کانوں میں پیپ بھر گیا تھا۔ کچھ دن تک جب مجھے کچھ سنائی نہ دیا تو میں ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے صفائی کی۔ ایک گھنٹے کے بعد دھلائی کی نوبت آئی۔ کچھ دن کی محرومی کے بعد جب میں نے آواز سنی تو میں غیر معمولی حد تک خوش ہو گیا تھا اور کہنے لگا تھا خدایا تو نے کتنی بڑی نعمت مجھے دی ہوئی تھی اور میں اس کی طرف توجہ تک نہیں دیتا تھا۔

آدمی کی بدبختی یہ ہے کہ وہ نعمتوں کی شکر گزاری تو کجا نعمتوں پر توجہ تک نہیں دیتا۔ جب تک نعمت اس کے ہاتھوں سے لے لی نہیں جاتی اس وقت تک اسے اس کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ہونا یہ چاہئے کہ زوال نعمت سے پہلے آدمی قدر نعمت پہچانے۔ **والذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم** (سورۂ محمدؐ ۴۷: آیت ۱۲) ترجمہ: جو کافر ہیں وہ دنیا میں چین کرتے ہیں اور اس طرح بے فکری سے کھاتے پیتے ہیں جیسے چوپائے کھاتے پیتے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

خدا کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ انسان کے جسم میں بھی یہ نعمتیں فراواں ہیں اور اس کی روح بھی طرح طرح کی اخلاقی جذباتی اور عرفانی نعمتوں سے مالامال ہوتی ہے۔ انسان اپنے ہر طرف نعمتیں ہی نعمتیں دیکھتا ہے۔ پوری دنیا نعمتوں سے بھری ہوئی ہے۔ زمین و آسمان بلکہ کائنات خدائے تعالیٰ نے انسان کے

تصرف میں دے دی ہے۔ اور اس سے بس یہ چاہا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اپنی زندگی کے کچھ لمحات شکر گزاری کے لئے وقف کر دے۔

یہ شکر گزاری خود ایک نعمت ہے۔ اس کا فائدہ خدا کو نہیں، خود ہم کو حاصل ہوتا ہے۔ شکر کے ذریعے نعمات خدا میں فراوانی پیدا ہوجاتی ہے۔ **ولان شکرتم لازیدنکم** (سورۂ ابراہیم ۱۴: آیت ۷) اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں ضرور تمہارے لئے نعمتوں میں اضافہ کردوں گا۔ شکر کے ذریعے یعنی اطاعت خدا کے ذریعے انسان بلند درجات اور زبردست کمالات حاصل کر لیتا ہے۔ یقیناً شکر سے مراد یہ نہیں ہے کہ محض زبان سے شکر ادا کیا جائے۔ شکر سے مراد یہ ہے کہ احکام خدا کی پابندی کی جائے اور خوشنودی خدا ہی کی فکر رکھی جائے۔ یہ شکر ہی ہے جو انسان کو ملائکہ سے برتر بنا دیتا ہے۔ اور یہ ناشکری ہی ہے جو انسان کو جانوروں سے بدتر کر دیتی ہے۔ جس طرح شکر کرنے کا فائدہ خدا کو نہیں خود انسان کو ملتا ہے اسی طرح ناشکری کا نقصان خدا کو نہیں خود انسان کو ہوتا ہے۔ **لھا ماکسبت وعلیھا مااکتسبت** (سورۂ بقرہ ۲: آیت ۲۸۵) "نفس جو کچھ بھلائی کرتا ہے اس کا فائدہ اسی کو ملتا ہے جو کچھ برائی کرتا ہے اس کا نقصان بھی اسی کو اٹھانا پڑتا ہے۔"

امید ہے کہ خداوند تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے گا۔ اپنے قرب کی اعلیٰ منزلوں تک رسائی کا ہمیں موقع دے گا۔ ہمارا مقصد زندگی تو یہی ہے۔

☆☆ .... ☆☆ ...... ☆☆

پانچواں درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معرفت کی راہ

انسان کو اپنی ابتداء بھی پہچانی چاہئے اور اپنی انتہا کا بھی اسے علم ہونا چاہئے۔ اسے یہ بھی جاننا چاہئے کہ پہلے وہ نہیں تھا' کچھ نہیں تھا۔ پھر عدم سے وجود میں لانے والا اس کا کوئی خالق ہے۔ اور اسے یہ بھی جاننا چاہئے کہ موت کے بعد روح کے جسم سے جدا ہو جانے کے بعد بھی اس کی روح فنا نہیں ہوتی ہے اور وہی خالق ایک دن دوبارہ اسے زندہ کرے گا۔ اس کے مردہ جسم کے ذرات کو دوبارہ یکجا کر کے دوبارہ اس میں وہی روح پھونک دے گا جو دنیا میں زندگی بھر اس کا جسم سنبھالے ہوئے تھی۔

دوسرے الفاظ میں انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے خالق کی یعنی ایک خدا کی معرفت حاصل کرے اور قیامت کے دن پر بھی یقین رکھے۔ یہ دونوں باتیں اصول دین میں شامل ہیں۔

انسان کے لئے معرفت خدا حاصل کرنے کی بہت سی راہیں ہیں۔ معرفت کی ایک آسان راہ یہی ہے کہ آدمی مخلوقات کو دیکھ کر ان کے خالق تک پہنچے۔ خود کو دیکھے اور اپنے خالق کی حکمت و قدرت کا قائل ہو جائے۔ مثلاً یہ غور کرے کہ اس کے جسم کی ایک ہڈی بھی زائد نہیں ہے اور ہر ہڈی اپنی جگہ اپنا کام خوب انجام دے رہی ہے۔ یہاں سے یہ نتیجہ نکالے کہ اس کا خالق بے انتہا حکمتوں والا ہے اور ایسی لاجواب قدرت رکھتا ہے کہ جس چیز کا وجود ہی نہ تھا اسے وجود عطا کر سکتا ہے۔ اور ایسا وجود عطا کر سکتا ہے جو سراپا اس کی حکمت و قدرت کی منہ بولتی تصویر ہو۔

مادہ خود خالق نہیں ہو سکتا

الا یعلم من خلق (سورۂ ملک ۶۷ آیت نمبر ۱۴) "کیا آدمی نہیں جانتا کہ اسے کس نے خلق کیا ہے؟"

کیمونسٹ لوگ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا نہیں ہے۔ نعوذ باللہ اس دنیا کے بعد کسی دوسرے عالم کا تصور غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مادے نے ترقی کی ہے اور باشعور انسان کا روپ اختیار کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ انسان کو اور پوری کائنات کو خدا نے خلق کیا ہے۔ خلق خدا کا ایک ذرہ بھی حکمت و مصلحت کے بغیر پیدا نہیں ہوا ہے۔ اتنی حکمت رکھنے والا خالق کیا محض مادے کو قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا محض مادے میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اتنی ساری حکمتوں اور مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر کچھ خلق کرے؟!

کیمونسٹ حضرات ایک طرف کہتے ہیں کہ مادہ بے شعور ہوتا ہے اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ مادے نے ترقی کی اور باشعور انسان کا روپ دھار لیا۔ بے شعور مادے کو اتنا شعور کہاں سے ملا کہ وہ ترقی کر کے اور باشعور انسان کا روپ دھار سکے؟! بہتر چیز کا انتخاب کرنا اور بہتر روپ کو اختیار کرنا بغیر شعور والے مادے کا کام کیسے ہو سکتا ہے؟! یہ تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک دوسرے کی ضد و نقیض اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی دو باتیں کہنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اپنی تسکین کے لئے اور خدا کا اور آخرت کا انکار کرنے کے لئے وہ ایسی باتیں تراشتے ہیں جبکہ سائنس اور دوسرا کوئی علم ان کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ **مالھم بذالک من علم ان ھم الا یظنون** (سورۂ جاثیہ ۴۵ آیت ۲۴) یعنی "ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی علم و یقین نہیں ہے۔ وہ تو بس اپنے گمان کے مطابق بات بنا رہے ہیں۔"

ڈارون پر اعتراض

بے شعور مادے کے بارے میں ایسا نظریہ رکھنے والے ایک مادہ پرست

آدمی ڈارون نے مثلاً یہ شوشا چھوڑا تھا کہ "انسان اصل میں بندر تھا۔ فطرت نے بتدریج اسے ترقی دی ہے۔ اس کی دم ختم کر دی ہے۔ جھکی ہوئی کمر کو سیدھا کر دیا ہے۔ بدن پر ہر طرف اگے ہوئے بڑے بڑے بال جھاڑ دیئے ہیں..."۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "فطرت" نے یہ "عنایت" صرف ایک دو بندروں ہی تک کیوں محدود رکھی جن کی نسل سے بقول ڈارون یہ آج کا انسان ہے اور باقی بندروں کی نسلیں آج تک بندر ہی کیوں بنی ہوئی ہیں؟!

بات یہی ہے کہ ڈارون کے جد اعلیٰ کی کمر تو ان کے بقول سیدھی ہو گئی مگر خود حضرت ڈارون کی عقل میں کجی آ گئی۔ دراصل ایسے لوگ حق کے آگے سر تسلیم خم کرنا نہیں چاہتے۔ حقیقتوں کو سمجھتے ہیں مگر پھر بھی انکار کرتے ہیں اور انکار اس لئے کرتے ہیں تاکہ دین کی قید سے آزاد رہیں اور انسان ہو کر بھی بندر بنے رہیں!

عقل و شعور مادے کی پیداوار نہیں ہے

سوال یہ ہے کہ انسان عقل و شعور رکھتا ہے یا نہیں؟ خود مادہ پرست لوگ کہیں گے کہ ہاں انسان عقل و شعور رکھتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ مادہ عقل و شعور رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مادہ پرست لوگ کہیں گے کہ مادہ عقل و شعور نہیں رکھتا۔ اب سوال یہ ہے کہ بے شعور چیز کیا عقل و شعور رکھنے والے انسان کو خلق کر سکتی ہے؟ کیا کوئی عقلمند انسان ایسی بات کر سکتا ہے؟ جس شخص کے گھر میں پانی کا ایک قطرہ نہ ہو وہ اپنے مہمان کو پانی فراہم کر سکتا ہے؟ جس چیز میں روح نہ ہو کیا وہ کسی ذی روح کو خلق کر سکتی ہے؟ یہ روح اتنی صلاحیت رکھتی ہے کہ عقل کی کمند کہکشاں اور دیگر دور دراز کے اجرام فلکی پر ڈال سکتی ہے؟ اب جبکہ مادے میں ایسی صلاحیت سرے سے نہیں ہے تو پھر یہ کہاں سے آئی؟ پس کہنا پڑے گا کہ عقل و شعور مادے کی پیداوار نہیں

ہے۔

علم و معرفت

جسم جتنی جگہ گھیرتا ہے بس اس سے زیادہ اس کا احاطہ نہیں ہوتا لیکن روح اور عقل کا احاطہ پوری کائنات پر ہے۔ دنیا بھر کی باتوں پر ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ انگلی میری اس دوسری انگلی کو پہچانتی ہے۔ پھر یہ پہچاننے والا کون ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ انسان کے اندر جسم کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو مادی نہیں ہے اور وہی چیز علم و معرفت بھی رکھتی ہے اور عقل و شعور بھی۔ اس کو ہم روح کہتے ہیں۔ محض جسم خدا کی بے انتہا قدرت دیکھ کر معرفت حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ روح ہے' یا اسے عقل کا نام دے دیجئے۔ جس میں اتنی صلاحیت ہے۔

آخرت میں بدن کی کیفیت

دنیا میں انسان کو جو جسم عطا کیا گیا ہے وہ بھی مادی ہے اور آخرت میں جو جسم اسے ملے گا وہ بھی مادی ہو گا۔ البتہ کچھ فرق ہو گا۔ وہ فضلات اور کثافتیں جو اس دنیا میں جسم کا لازمہ ہیں مثلاً پیشاب' پاخانہ' پسینہ' ناخن اور بال جنت میں نہ ہوں گے۔

دنیوی جسم کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے لیکن جنت میں نہیں تھکے گا۔ دنیوی جسم کبھی بیمار ہو جاتا ہے لیکن جنت میں اسے کوئی بیماری لاحق نہیں ہو گی۔ اور ایسے دیگر کچھ فرق ہیں جو دنیا اور آخرت کے جسم میں پائے جاتے ہیں۔

اب یہ کیسے ہو گا کہ جسم تو وہی ہے مگر اس میں اتنی ساری صلاحیتوں کا اضافہ ہو جائے؟ اس کو سمجھانے کے لئے علماء تشبیہ پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ فی الحال اس کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ تشبیہ یہ دیتے ہیں کہ شکم مادر میں

موجود بچے کو جتنا بھی سمجھانا چاہیں کہ باہر کی دنیا میں پھل ہیں، طرح طرح کی غذائیں ہیں، خوبصورت پھول پودے ہیں، قسم قسم کے حیوانات ہیں، پھر بھی جب تک وہ ان کو دیکھ نہ لے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ خود ارشاد خداوندی ہے **فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون** (سورۂ سجدہ ۳۲ آیت ۱۷) "اس کو تو کوئی شخص جانتا ہی نہیں کہ ان لوگوں کی کارگزاریوں کے بدلے کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے ڈھکی چھپی رکھی ہے۔"

ان کے پاس دلیل نہیں ہے

آخرت کا انکار کرنے والے لوگ بس اسی طرح کہتے ہیں کہ "ہم کو سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہڈی برادہ بن کر بکھر جاتی ہے اور مٹی بن جاتی ہے تو کیسے دوبارہ زندہ انسان بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہے!"۔ "سمجھ میں نہیں آتا" کوئی دلیل نہیں ہے، یہ تو نا سمجھی کا اعتراف ہے۔ جو خدا ایک قطرے سے انسان کا اتنا حیرت انگیز جسمانی نظام بنا دیتا ہو اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے، بلکہ زیادہ آسان ہے کہ وہ مٹی میں ملے ہوئے ہڈیوں کے برادے کو دوبارہ انسانی ڈھانچے کی شکل دے دے۔ خدا خود ارشاد فرماتا ہے: **و ھو اھون علیہ** (سورۂ روم ۳۰ آیت ۲۷) "خدا جو مخلوقات کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے زیادہ آسان ہے۔" **انہ علی رجعہ لقادر** (سورۂ طارق ۸۶ آیت ۸) "بے شک خدا اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قدرت رکھتا ہے۔"

اسی طرح ارشاد ہے کہ **ایحسب الانسان الن نجمع عظامہ بلی قدرین علی ان نسوی بنانہ** (سورۂ قیامت ۷۵ آیت ۳ اور ۴) "کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کو ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے کے بعد جمع نہ کریں گے؟ ضرور جمع کریں گے بلکہ ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کریں۔"

اس آیہ شریفہ کی تفسیر کرتے ہوئے مصری مفسر آقائے طنطاوی لکھتے ہیں

کہ بیسوی صدی سے پہلے تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ خدائے تعالی انگلیوں کی پور پور کا ذکر کیوں فرما رہا ہے۔ لیکن اب سمجھ میں بات آگئی ہے کہ یہ تو ایک معجزہ ہے۔ دنیا میں آج ساڑھے چار ارب لوگ زندگی گزار رہے ہیں اور ہر انسان کی انگلیوں کی پوریں کھال کے نقش و نگار کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اسی لئے ایک طولانی مدت سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ دستخط اگر نہ آتی ہو تو اس کے بجائے انگوٹھے کا نشان لے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح انگلیوں کے نشانات کی مدد سے مجرموں کو تلاش کیا جانے لگا ہے۔

جتنے بندے ہیں اتنے چہرے ہیں

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ بالشت بھر کی یہ شکل و صورت ہر انسان نے مختلف پائی ہے۔ جتنے بندے ہیں اتنے چہرے ہیں۔ حتی کہ جڑواں بچوں کے چہروں میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ گلے کی ہڈی بھی ہر انسان کی مختلف شکل والی ہوتی ہے اور آواز بھی ہر انسان نے مختلف پائی ہے۔ قدرت کا نظام کتنا حیرت انگیز ہے! اگر چہرے مختلف نہ ہوتے، اگر انگلیوں کے نشانات مختلف نہ ہوتے، اور اگر آوازیں مختلف نہ ہوتیں تو ظالم کے بجائے مظلوم کو پکڑا جاتا اور طرح طرح کے فریب دیئے جاتے۔ اگر خدائے حکیم کی یہ قدرت نہ ہوتی تو دنیا میں معاشرتی زندگی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ **و لقد علمتم النشاۃ الاولی فلولا تذکرون** (سورۂ واقعہ ۵۶ آیت ۶۲) "تم نے پہلی پیدائش تو سمجھ ہی لی ہے کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔" تم نے دیکھا کہ کتنی حکمتیں اور مصلحتیں اس میں پوشیدہ ہیں۔ تمہیں غور کرنا چاہئے کہ خالق حکیم کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ تمہیں دوبارہ زندہ کر دے۔ وہاں دوسرا عالم ایسا ہوگا کہ خدا کی قدرت کے کرشمے یہاں سے زیادہ نظر آئیں گے اور وہ قائم و دائم رہنے والا عالم ہوگا۔ **والاخرۃ خیر و ابقی** (سورۂ اعلیٰ ۸۷ آیت ۱۷) "آخرت کا عالم بہتر اور

زیادہ وسیع بھی ہو گا اور زیادہ باقی رہنے والا بھی ہو گا۔" خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کے ایک خالق کا وجود ضروری اور عقل کے مطابق ہے اسی طرح قیامت کا وجود بھی ضروری اور عقل کے مطابق ہے۔

قبر کا احترام

اسٹالن کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی مشکل مسئلہ مشورے کے باوجود حل نہیں ہوتا تھا اور اٹک کر رہ جاتا تھا تو وہ لینن کی قبر کے سرہانے جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ اتنی دیر وہیں رکا رہتا تھا کہ وہ مسئلہ حل ہو جائے۔ مادہ پرست اسٹالن کا ضمیر گواہی دیتا تھا کہ لینن مرنے کے بعد بھی مرا نہیں ہے۔ لینن کی قبر پر جا کر اس سے مسئلہ حل کرنے کے لئے مدد طلب کرتا تھا۔ مادہ پرست لوگ آخر کیوں گمنام فوجی کی قبر بناتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں؟ اس کا سبب یہی ہے کہ ان کا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے، آخرت بھی کوئی چیز ہے، مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہے۔ اگر وحی نہ بھی آتی تب بھی ضمیر کی پکار ایسی گواہی دیتی رہتی اور انسانی فطرت بھی اس گواہی میں شریک ہو جاتی۔

اب سوال یہ ہے کہ جب عقل و ضمیر اور انسانی فطرت توحید اور قیامت کی گواہی دیتے ہیں تو مادہ پرست لوگ اس کے خلاف انکار کیوں کرتے ہیں؟

اس کا جواب خود خدا نے سورہ قیامت میں کچھ یوں دیا ہے **بل یرید الانسان لیفجر امامہ** (سورۂ قیامت ۷۵: آیت ۵) "البتہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے آگے ہمیشہ بس برائی کرتا چلے اور سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔" نفسانی خواہشات کے سلسلے میں آدمی بے لگام ہو جانا چاہتا ہے۔ فرائض اور پابندیوں کو نظرانداز کر دینا اور پیچھے دھکیل کر اور آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ ضمیر اور فطرت کو اپنے ظلم کے قدموں سے کچل دینا چاہتا ہے۔ اپنے خالق کو پہچان سکنے کے باوجود نہیں پہچانتا کہ کہیں فرائض کا بوجھ اور ممنوعات کی فہرست سامنے نہ آ جائے۔ ہائے رے نادان انسان! حقیقت کو نظرانداز کرنے سے

حقیقت بدل نہیں جاتی۔

ہارون اور مامون

کہتے ہیں کہ لوگوں نے مامون سے پوچھا "آپ کو کس طرح حضرت علی رضا سے لگاؤ پیدا ہوا؟" اس نے جواب دیا۔

ایک دفعہ میں اپنے والد کے ساتھ مدینہ گیا تھا۔ بڑے بڑے لوگ میرے والد سے ملاقات کے لئے آ رہے تھے۔ ایک دن ایک کمزور سا شخص وارد ہوا۔ میں نے دیکھا کہ والد نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور لے جا کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔ انتہائی ادب سے اس کے ساتھ بات چیت کی۔ رات کو میں نے اپنے والد سے پوچھا "وہ شخص کون تھا جس کا آپ اتنی عاجزی سے احترام کر رہے تھے؟" والد نے کہا "وہ موسیٰ بن جعفرؑ ہیں۔" میں نے پوچھا "کون موسیٰ بن جعفرؑ؟" انہوں نے جواب دیا "وہی جو میرا اور تمہارا امام ہے۔" میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حق پر نہیں ہیں۔" یہ سن کر میرے والد نے کہا "نہیں خلافت ان کا حق ہے۔" میں نے جسارت کرتے ہوئے کہا "اگر ایسا ہے تو پھر آپ ان کو جیل میں ڈال دینے یا شہر بدر کر دینے کی فکر میں کیوں لگے رہتے ہیں؟" جواب ملا "اقتدار باپ بیٹے کو نہیں دیکھتا۔ اگر بیٹا بھی مزاحمت کرے تو اسے قتل کر دیتا ہے یا اس کی آنکھیں نکلوا دیتا ہے!"

کچھ ایسی ہی بات دیگر بادشاہوں مثلاً نادر شاہ سے بھی نقل ہوئی ہے۔

الغرض آدمی اقتدار کی خاطر اتنا پست ہو جاتا ہے کہ واضح ترین فرائض کو بھی نظرانداز کر دیتا ہے اور کرسی کی خاطر ہر طرح کا ظلم و جرم روا سمجھتا ہے۔

دنیا کی محبت

مجھے یاد ہے کہ گزشتہ سال امام خمینی قانونی اور شرعی طور پر صدر مملکت کا عہدہ جب سونپ رہے تھے تو انہوں نے اس حدیث کو بیان فرمایا تھا **حب الدنیا**

واس کل خطیتہ "دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔"

یہ بات سب کو پیش نظر رکھنی چاہئے۔ دنیا کی محبت فرائض کو نظرانداز کرنے پر اکساتی ہے۔ فرائض کو انسان اپنی خواہشات کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے لگتا ہے اور جس طرح بھی ہو ان کو کچل کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ خواہ اسے خدا، رسولؐ اور امامؑ کا انکار ہی کرنا پڑے۔

مُنافقین

ہر انصاف پسند آدمی اس بات کا قائل ہو چکا ہے کہ امام خمینی عوام کی خیرخواہی اور خدمت خلق کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ وہ مستضعفین کے غمخوار ہیں۔ غریبوں اور بیکس لوگوں کے ہمدرد ہیں۔ انہوں نے عملی طور پر بارہا اپنے قول کی سچائی ثابت کی ہے۔

مخالفت میں اٹھنے والے یہ چھوٹے چھوٹے گروہ کیا اب تک امام خمینی کو صحیح طرح پہچان نہیں پائے ہیں؟ ناممکن ہے کہ انہوں نے پہچانا نہ ہو۔ پھر یہ کیوں مخالفت اور مزاحمت پر کمربستہ ہیں؟ بات یہی ہے کہ یہ لوگ نفسانی خواہشات کو نظرانداز نہیں کرسکتے اگرچہ خمینیؒ جیسے رہبر کو نظرانداز کرنا پڑے اور اگرچہ ظالم ترین افراد کو اپنا لیڈر ماننا پڑے۔

☆☆......☆☆......☆☆

چھٹا درس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعلیم اور ثقافت

کچھ عرصہ قبل ثقافتی اور تعلیمی انقلاب کی بات امام خمینی نے چھیڑی تھی۔ اس موضوع پر نشرو اشاعت کے وسائل نے بھی کچھ نہ کچھ بیان دیا تھا اور کچھ عرصے تک یہ موضوع زیر بحث رہا تھا۔ درس اخلاق سے پہلے میں اس سلسلے میں کچھ وضاحتیں کر دینا چاہتا ہوں۔ تعلیمی انقلاب سے مراد یہ نہیں ہے کہ یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں رائج فزکس، کیمسٹری، حساب اور طب کی کتابیں نہ پڑھائی جائیں اور یہ علوم اب سکھائے نہ جائیں۔ تعلیمی انقلاب سے یہ مراد بھی نہیں ہے کہ دینی طلبہ علم فقہ اور علم اصول پڑھنا چھوڑ دیں۔ اس سے مراد دراصل یہ ہے کہ تعلیم کو معاشرے کی ضروریات کے عین مطابق بنا دیا جائے۔ تعلیمی نصاب کو زیادہ کامل و جامع اور بہتر کر دیا جائے۔ ہم کو کئی شعبوں میں ماہر (اسپیشلسٹ) افراد کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر دینی علوم اور دنیوی علوم میں اہتمام کیا جائے اور طلبہ کی توجہ اسپیشلسٹ بننے کی طرف مبذول کی جائے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی تعلیم و تربیت کا جو فقدان ہے اس کے پیش نظر دنیوی علوم کے ساتھ ساتھ اسلامیات کو بھی رائج کیا جائے تاکہ اسلامی تعلیم و تربیت بھی طلبہ کو ملتی رہے اور وہ انسان بن کر فارغ التحصیل ہوں۔ تزکیہ نفس اور اسلامی تہذیب سے ناآشنا نہ رہیں۔

کمثل الحمار بحمل اسفارا (سورۂ جمعہ ۶۲: آیت ۵) بدتہذیب اسکالر اس آیہ قرآنی کی روشنی میں ایسے گدھے کی طرح ہوتا ہے جس نے اپنی پشت پر بڑی بڑی کتابوں کا بوجھ لاد لیا ہو۔ ظاہر ہے ایسی کتابوں کا کوئی فائدہ گدھے کو

نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اس کے لئے بوجھ بن جاتی ہیں۔ گناہ اور بد کرداری کا بوجھ۔ جب آدمی باطنی طور پر آدمی نہ ہو تو پڑھنے سے پہلے محض حیوان تھا اور پڑھنے کے بعد وہ درندہ بن جاتا ہے۔ دوسروں کو لوٹنے کھسوٹنے والا درندہ۔ خون چوسنے والا درندہ۔ کمزور کو اپنے سامنے مجبور دیکھ کر خوش ہونے والا درندہ۔ ایسا درندہ جو جنگل کے درندوں سے زیادہ نقصان دہ ہو۔

تہذیب اور تربیت

تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی بہت ضروری چیز ہے۔ اس بات کی تربیت ہونی چاہئے کہ بچے حیوانی صفتوں کو سمجھیں اور ان سے پرہیز کریں۔ انسانی صفتوں کو پہچان لیں اور انہیں پوری طرح اپنانے کی کوشش کریں۔ تعلیم محض سند حاصل کرنے کے لئے نہ ہو عمل کرنے کے لئے ہو۔ تہذیب اور تربیت بھی ساتھ ساتھ ہو۔ آدمی انسان بن جائے معاشرے میں انسانیت کے ساتھ رہے۔

چلتے پھرتے سیدھے سادھے راہ گیر کو چھیڑنا اس اعتبار سے نہیں ہوتا کہ کتے کے پنجے خطرناک اور دانت تیز ہوتے ہیں۔ شریر کتا ایسا اس لئے کرتا ہے کہ درندگی کی صفت اس کے اندر موجود رہتی ہے۔ انسان میں بھی درندگی اور غصے کی صفت ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس میں انسانیت کی صفت بھی ہوتی ہے۔ اب یہ انسان کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کی تربیت کرے، درندگی کی صفت کو قابو میں رکھے اور انسانیت کا عادی ہو جائے۔

عادت ایک دم سے نہیں بنتی

البتہ کوئی عادت ایک دم سے بن نہیں جاتی۔ بار بار کے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح عادت کا بگڑنا بھی ایک دو دفعہ کے قول و فعل

سے نہیں ہوتا۔ اگر ایک سلجھا ہوا آدمی ایک دفعہ زبان سے کوئی نامناسب بات کہے یا ایک دفعہ ہاتھ پاؤں سے کسی پر ظلم کرے تو اس کا اثر تو باطن پر پڑتا ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ عادت بگڑ جائے۔ بار بار ایسا کرنے سے بری عادت پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح ایک بگڑا ہوا آدمی اگر ایک دو دفعہ سلجھے ہوئے انداز میں بات کر لے یا ایک دو دفعہ لوگوں سے مناسب سلوک کرے تو اس سے بگڑی ہوئی عادت ختم نہیں ہو جاتی۔ بگاڑ جتنا ہوتا ہے اسے سنوارنے کے لئے اتنی ہی محنت اور اتنا ہی زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اسی طرح سلجھاؤ جتنا ہوتا ہے اس کے بگڑنے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے۔

فرمودۂ امیر المومنینؑ

نہج البلاغہ میں مولا امیر المومنین علی علیہ السلام کا یہ ارشاد موجود ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں: **الخیر منہ ماسول و الشر منہ ماموں** "پرہیزگار آدمی وہ ہے جس سے بھلائی کی امید رکھی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ رہیں۔" صحیح معنوں میں انسان تو پرہیزگار آدمی ہی ہوتا ہے۔ پرہیزگاری صرف نماز، روزہ، حج اور دیگر عبادتوں یا ذکر و تسبیح کے ذریعے کمال تک نہیں پہنچتی۔ انسانیت کو تقویت دینے اور اپنے اندر کی حیوانیت دبانے کے لئے زبان، ہاتھ پاؤں، آنکھ اور دل غرض ہر عضو کی ریاضت ضروری ہوتی ہے۔ اس ریاضت و محنت کا اثر نفس پر پڑتا ہے۔ ایک اور جگہ نہج البلاغہ ہی میں امیر المومنینؑ کا یہ بیان بھی موجود ہے کہ **و انما نفسی اروضہا بالتاتی بہا امنتہ یوم القیمتہ** "میں اپنے نفس کو ریاضت کے ذریعے آراستہ کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہوں تاکہ یہ قیامت کے دن محشر کی ہولناکی سے امان میں رہے۔"

آپ علیؑ کے شیعہ ہیں علیؑ کو ماننے والے ہیں۔ شیعہ کے معنی ہی پیروی کرنے والے کے ہوتے ہیں۔ پس آپ کو بھی چاہئے کہ آپ علیؑ کی پیروی کریں۔ اور نفس کی تربیت سے غافل نہ ہوں۔

غضب کی قوّت

آج میں ایک حیوانی خصلت کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اسے خوب پہچان لیں اور نہ صرف اس سے پرہیز کریں بلکہ اس کی ضد خصلت کو جو انسانی خصلت ہے' اپنانے کی کوشش کریں۔

غصہ یا غضب ایک فطری چیز ہے۔ یہ کیفیت انسان یا حیوان پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہو جاتا ہے۔ کسی کی گالی سن کر یا کسی کا ظلم سہہ کر اس کا خون جوش مارتا ہے انتقام کا جذبہ سر ابھارتا ہے۔ بعض لوگوں کا چہرہ ایسے عالم میں سرخ ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کی سانس پھول جاتی ہے اور بعض لوگوں کا چہرہ وقتی طور پر غضب کے مارے بگڑ سا جاتا ہے۔

اگر آدمی کو غضب پر قابو نہ ہو' دوسرے الفاظ میں اپنے نفس کی اس حیوانی خصلت پر قابو نہ ہو تو وہ بھی گالی بکنے لگتا ہے۔ ہاتھ پاؤں چلانے لگتا ہے۔ غصہ بڑھ جائے تو یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ جانور بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ حق و باطل اور حلال و حرام کا لحاظ نہیں کرتا۔ غصے میں انتقام کے سوا اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ جب آدمی پر غصہ سوار ہوتا ہے اور انتقام کا جذبہ بھی سرد نہیں ہوتا تو وہ خود پر ظلم کرنے لگتا ہے۔ اپنے کپڑے پھاڑ لیتا ہے۔ خود کو مارنے لگتا ہے۔ کبھی خون اتنا جوش مارتا ہے کہ اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ میں ایسے افراد سے بھی واقف ہوں جن پر غصے کے مارے سکتہ طاری ہوا ہے اور پھر وہ اسی عالم میں مر گئے ہیں یا فالج کا شکار ہو گئے ہیں! وہ نمازی بھی رہے ہیں۔ مگر صرف نماز آدمی کو اس وقت تک انسان نہیں بناتی جب تک آدمی نفس پر قابو پانے کی فکر نہ کرے۔ اپنی حیوانی خصلت کو برے کاموں سے تقویت دینے کے بجائے دبا کر رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کتے اور بھیڑیئے غصے میں آتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ کھال ادھیڑ دیتے ہیں لیکن آدمی

ایسے عالم میں دوسرے کی عزت و عفت تک کی پروا نہیں کرتا۔ آبروریزی اور عصمت دری جسمانی مظالم سے کہیں زیادہ بڑھ کر ظلم ہے۔ خدا ہم سب کو پناہ میں رکھے۔

پس کیا کرنا چاہئے؟

حیوانیت کی اس خصلت سے بچنے کے لئے آدمی کو کیا کرنا چاہئے؟ جواب یہی ہے کہ غصے کے عالم میں کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پانا چاہئے۔ یہ کام آسان ہے۔ البتہ کچھ مشق لازمی ہے۔ اگر آدمی غصے پر قابو پانا نہ سیکھے تو عادت رفتہ رفتہ بگڑنے لگتی ہے۔ کبھی تو قابو پانا مشکل نظر آتا ہے اور کبھی خود پر قابو رکھنا محال ہو جاتا ہے۔ جوان لوگ بھی ابھی سے اس کی مشق کریں۔ ابھی حیوانیت آپ جوانوں میں جڑ پکڑے ہوئے نہیں ہے۔ ابھی آپ کی طرح آپ کی طاقت و ہمت بھی جوان ہے۔ اگر جوانی میں آپ نے خود پر قابو پانا نہ سیکھا تو بڑھاپے میں کام سخت مشکل یا ناممکن ہو کر رہ جائے گا۔ عادت ڈالئے۔ اگر بالفرض کسی نے آپ کو گالی دی تو آپ جواب دے سکنے کے باوجود خود پر قابو پا کر جواب نہ دیں۔ اپنی جگہ بدل دیں اور وہاں سے ہٹ جائیں۔

حضرت مالک اشتر

مالک اشتر کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ وہ لشکر علیؑ کے سپہ سالار تھے۔ خود حضرت علی علیہ السلام ان کے بارے میں فرماتے ہیں "جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا' اسی طرح مالک بھی میرے ساتھ رہے ہیں۔" اپنے قبیلے "کندہ" کے سردار اور لشکر حق کے سپہ سالار مالک اشتر کا یہ حال تھا کہ بازار کوفہ میں خریداری کے لئے خود جاتے تھے اور ان کا لباس بوسیدہ اور کوتاہ ہوا کرتا تھا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک بگڑے ہوئے جوان نے مذاق ہی مذاق میں

مالک اشتر کی طرف مٹی اچھال کر مار دی۔ وہ ان کو نہیں پہچانتا تھا۔ مالک نے اسے کچھ نہیں کہا اور آگے بڑھ گئے۔ لوگوں نے اس جوان کو گھیر کر کہا "تم پہچانتے ہو کہ وہ کون گزرا ہے؟" اس نے جواب دیا "نہیں۔" لوگ کہنے لگے "وہ مالک اشتر تھے!"۔

نوجوان بہت ڈر گیا۔ وقت کے سپہ سالار کے ساتھ اس نے گستاخی کی تھی۔ اس نے مالک کو ڈھونڈ کر ان سے معافی مانگنے کی ٹھانی۔ پوچھنے پر لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ بھی مسجد میں چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ مالک نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ جب مالک نماز سے فارغ ہوئے تو وہ ان کے قدموں میں جا کر گر پڑا اور کہنے لگا میں آپ کو نہیں پہچانتا تھا میں نے جسارت کی ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے!

مالک اشتر نے فرمایا: "میں نے اسی وقت تمہیں معاف کر دیا تھا۔ ابھی مسجد میں اس لئے آیا تھا تاکہ نماز پڑھوں اور دعا کروں کہ خدا بھی تجھے معاف کر دیجئے!"

مالک اشتر علیؑ کے شیعہ تھے۔ کیا ہم بھی ایسے ہی شیعہ ہیں؟ **والکاظمین الغیظ** (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۳۴) "متقی وہ ہیں جو غصے پر قابو رکھتے ہیں۔" کیا ہم واقعی امام المتقینؑ کے شیعہ ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کوئی آپ پر مٹی کا ڈھیلا مارے تو آپ جواب میں اس پر سخت پتھر آزمانے لگیں؟!
مومنین کو تو مالک اشتر کی طرح ہونا چاہئے کہ **واذا مروا باللغو مروا کراما** (سورۂ فرقان ۲۵: آیت ۷۲) یعنی "جب وہ کسی ناشائستہ بات کا سامنا کرتے ہیں تو باوقار طریقے سے اسے نظرانداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔"

درندگی کا جواب درندگی نہیں ہے

"اینٹ کا جواب پتھر سے دینا" انصاف نہیں ہے بلکہ ناجائز کاموں میں ٹکر کا اور برابر کا بدلہ لینا بھی جائز نہیں ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گالی کے

جواب میں گالی دینا جائز ہے۔ اصل کام حرام نہیں ہونا چاہئے۔ درندگی کا جواب درندگی نہیں ہے۔ انسانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ گالی دینے والے کو تہذیب اختیار کرنے اور تمیز سے بات کرنے کی تلقین کی جائے ورنہ دونوں میں کیا فرق رہ جائے گا اگر دونوں ہی ایک دوسرے کو گالی دینے لگیں گے!
مرحوم نراقی کی کتاب معراج السعادہ میں یہ حدیث نبویؐ لکھی ہوئی ہے کہ **المتسابان فی النار** "ایک دوسرے کو گالی دینے والے دونوں آدمی جہنمی ہیں!" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ **البادی منھما اظلم** "البتہ جس نے گالی دینے میں پہل کی تھی وہ زیادہ ظالم ہے!" مفہوم بالکل واضح ہے کہ گالی کے جواب میں گالی دینے والا بھی ظالم ہے البتہ گالی کی ابتداء کرنے والا شخص اس سے بھی بڑا ظالم ہے۔ گالی ہو یا کوئی بھی ظلم ہو وہ غضب اور غصہ کی پیداوار ہے اور غضب یا غصہ حیوانیت کی ایک صفت ہے۔
شیخ نراقی "معراج السعادہ" میں لکھتے ہیں کہ: گالی کے جواب میں یا تو خاموش رہنا چاہئے یا اگر جواب دینا بھی ہے تو بہت خیال رکھنا چاہئے کہ وہ جواب جھوٹ یا تہمت جیسی کسی حرام بات پر مشتمل نہ ہو۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ "تم جاہل ہو!" ظاہر ہے گالی دینے والا شخص اسلامی تہذیب سے جاہل ہے یا وقتی طور پر اسلامی تہذیب سے خود کو جاہل ظاہر کر رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ جوابی جملہ درست ہے ویسے بھی کون ہے جو جاہل نہ ہو! بہت سی باتوں سے انسان ناواقف یعنی جاہل ہوتا ہے!

انسانیت اپنانی چاہئے

انسان کو چاہئے کہ وہ انسانیت کا اصول اپنا لے ناپسندیدہ حالات دیکھ کر بگڑ نہ جائے۔ اپنی حیوانی جبلت کو ابھرنے نہ دے، بلکہ انسانی خصلت یعنی حلم اور بردباری کو غصے پر حاوی رکھے۔ انسان انس سے نکلا ہے۔ انس و محبت کی راہ اپنائے۔ حیوان کو تو حلم کا کوئی علم نہیں ہے وہ نہیں جانتا کہ حلم کیا چیز

ہے۔ اگر ہم میں بس غصہ ہی غصہ ہو تو ہمارے اور حیوان کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا! حیوان کو آخرت کی کوئی فکر نہیں ہوتی جبکہ انسان کے لئے یہ فکر لازمی ہے اور راہ انسانیت ہی انسان کے لئے راہ نجات ہے۔

انسان ہر صفت کے معاملے میں ایک دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے۔ چاہے تو مثلاً غصے کا راستہ اپنائے یا چاہے تو حلم اور بردباری کی راہ پر لگ جائے۔ چاہے تو انسانیت کی راہ اپنائے اور چاہے تو حیوانیت اور درندگی کے راستے پر چل پڑے۔ یہ اس کے اختیار میں خدائے تعالیٰ نے دیا ہے اور کوئی زبردستی نہیں ہے۔ زبان دی ہے تو ساتھ میں یہ اختیار بھی خدا نے دیا ہے کہ وہ چاہے تو گالیاں دے کر فتنہ بپا کرے اور چاہے تو اسی زبان سے اصلاح و نصیحت کی باتیں کرے اور کہیں کے بھڑکتے ہوئے فتنے کی آگ بجھا دے۔

البتہ خود پر' اپنے نفس پر اور اعضاء و جوارح پر قابو رکھنا بہت آسان بھی نہیں ہے۔ اس کے لئے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ کچھ اپنی خواہشات کو دبانا پڑتا ہے۔ کچھ اپنی توقعات کو کم کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسا کرتے رہنے کی عادت ڈالنی ہوتی ہے۔ اگر جھگڑے کی ابتداء ہی سے آدمی حلم اور برداشت کا راستہ اپنائے تو جھگڑا خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جھگڑے کی ابتداء کرنے والا شخص دوسرے کا حلم دیکھ کر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ ممکن ہے وہ دوسرے سے معافی بھی مانگ لے۔

محقق طوسیؒ کی بات

عظیم محقق علامہ خواجہ نصیر الدین طوسیؒ کے حالات بیان کرنے والے لکھتے ہیں کہ:

ایک دفعہ ایک جھگڑالو قسم کے شخص نے محقق طوسیؒ کو خط لکھا اور اس میں انہیں "کتا" لکھ دیا۔ اس کے جواب میں محقق طوسیؒ نے کچھ یوں تحریر فرمایا:

"میں نے بہت غور کیا کہ آپ نے مجھے کتا کیوں سمجھا ہے! میرے دو پیر ہیں جبکہ کتے کے چار ہوتے ہیں۔ اس کے دانت تیز ہوتے ہیں کہ وہ ہڈی توڑ سکتا ہے اور چبا سکتا ہے۔ جبکہ میرے دانتوں نے تو کام کرنا تک چھوڑ دیا ہے۔ کتے کی کھال جیسی ہوتی ہے ویسی میری نہیں ہے۔ اس کی ٹیڑھی سی ایک دم ہوتی ہے جبکہ میرے پاس سرے سے ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جھگڑالو شخص نہ صرف سدھر گیا بلکہ محقق طوسیؒ کا معتقد بھی بن گیا۔

اگر بالفرض وہ بھی لکھ دیتے کہ "کتے تو تم خود ہو! تمہارا باپ کتا ہے! تمہاری ماں کتیا ہے!" تو جھگڑا بڑھ جاتا اور نہ جانے کیا نتیجہ نکلتا۔

ایک واقعہ

اس سلسلے میں ایک واقعہ علماء نقل کرتے ہیں کہ جوتا بنانے والا ایک کاریگر بہت بداخلاق تھا۔ اپنی دکان میں بیٹھ کر وہ جوتے بناتا بھی تھا اور بیچتا بھی تھا۔ ایک دن صبح صبح اس کی دکان پر ایک آدمی آیا۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔ اس آدمی میں اور دکاندار میں کچھ یوں بات چیت ہوئی۔

آدمی: "کیا حال چال ہے؟"

دوکاندار: "ٹھیک ہوں۔"

آدمی: "آپ مجھے یہ بتائیے کہ جھگڑا کس طرح ہوتا ہے؟ جھگڑے کی بنیاد کیا چیز ہوتی ہے؟"

دوکاندار: "آخر صبح صبح یہ کیسا سوال ہے؟! تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟!"

آدمی: "نہیں، میں تحقیق کر رہا ہوں اور یہ بات سمجھنا چاہتا ہوں۔"

دوکاندار: "بھلے آدمی' شاید تمہاری عقل خراب ہو گئی ہے! میں کیا جانوں کہ جھگڑا کس طرح ہوتا ہے؟!"

آدمی: "جب تک آپ مجھے بتائیں گے نہیں میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں!"

دوکاندار: "تم مجھے کام نہیں کرنے دو گے؟!"

خلاصہ یہ کہ جھگڑا بڑھ گیا اور دوکاندار نے چمڑا کاٹنے والا آلہ اس آدمی کے سر پر مار دیا۔ سر سے خون بہنے لگا تو وہ آدمی کہنے لگا:

"سمجھ گیا سمجھ گیا! جھگڑا کس طرح ہوتا ہے سمجھ میں آگیا۔ ایک آدمی کسی بات کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور دوسرے کی مرضی کے خلاف اصرار پر اصرار کئے چلا جاتا ہے تو جھگڑا ہو جاتا ہے۔"

انسان کو چاہئے کہ دوسروں کی مرضی کے خلاف غیر ضروری طور پر بات کو طول نہ دے اور جھگڑے کا موقع فراہم نہ کرے۔ غیر ضروری طور پر کوئی ایسی بات کرے ہی نہیں جس سے دوسرے کو غصہ آسکتا ہو۔ انسان کا نفس ایک ایسی بھیڑ کی مانند بن جانا چاہئے جسے چراگاہ اور اپنے باڑے سے باہر نہ نکلنے کی تربیت دے دی گئی ہو۔ جواز کی حد میں نفس کی خواہشوں کو پورا ہونے دینا چاہئے لیکن نفس کو جواز کی حد سے باہر نکلنے نہیں دینا چاہئے۔ البتہ اس تربیت کے لئے کافی عزم و ہمت درکار ہے۔

عزم کی قوت

ایک روایت میں ہے کہ ایک پیغمبر کا خدا نے امتحان لینا چاہا۔ فرشتے اس کے پاس آکر کہنے لگے کل آپ کو کچھ کام انجام دینے ہیں۔ صحرا میں جا کر سب سے پہلی چیز جو آپ دیکھیں اسے کھالیں۔ پھر جو چیز آپ کو نظر آئے آپ اسے چھپالیں۔ الغرض فرشتوں نے اس پیغمبر کو اگلے دن انجام دینے کے لئے خدا کی جانب سے پانچ کام بتائے۔

بہرحال ہمارے موضوع سے مربوط پہلا کام ہے۔ یعنی وہ جو بھی چیز صحرا میں سب سے پہلے دیکھیں اسے کھالیں۔ وہ پیغمبر اگلے دن صحرا میں گئے۔ سب

سے پہلے جو چیز انہیں نظر آئی وہ ایک بڑی سے پہاڑی تھی دل میں کہنے لگے: "پہاڑی کو کیسے کھا جاؤں!! بہرحال مجھے حکم ملا ہے کہ یہ کام کروں۔ پس جہاں تک مجھ سے ممکن ہو گا مجھے انجام دینا چاہئے۔ آگے کا خدا مالک ہے۔"

اس عزم کے ساتھ وہ آگے بڑھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہر ہر قدم پر وہ پہاڑی جو کچھ فاصلے پر تھی، چھوٹی ہوتی جارہی ہے! وہ آگے بڑھتے رہے اور پہاڑی چھوٹی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک لقمے کے برابر پتھر کی شکل میں نظر آنے لگی! پیغمبر نے ہاتھ بڑھایا اور اسے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ تو پتھر نہیں ہے بلکہ شہد سے زیادہ شیریں اور مزیدار چیز ہے!!

خلاصہ یہ کہ وہ پیغمبر اپنے تمام امتحانوں میں کامیاب رہے۔ حکم خدا سے فرشتے آکر انہیں بتانے لگے کہ:

"آپ نے جو پہاڑی دیکھی تھی وہ غیظ و غضب وغصے کی پہاڑی تھی۔ اس کو ختم کرنے کا کام پہاڑی کی طرح سخت اور بڑا لگ رہا تھا۔ لیکن آپ نے بس یہ دیکھا کہ حکم خدا ہے اور اس سلسلے میں عزم کی قوت سے کام لیا تو رفتہ رفتہ وہ پہاڑی چھوٹی ہوتی گئی یہاں تک کہ آپ کی برداشت کے اندر معلوم ہونے لگی۔ برداشت کرنے کا عزم اس بات کا باعث بنا کہ غضب کی اتنی بڑی پہاڑی شہد سے زیادہ لذیذ چیز ثابت ہوئی۔"

ایک بزرگ نے فرمایا

ایک بزرگ ایک گلی میں سے گزر رہے تھے کہ کسی نے اوپر کے مکان سے جھاڑوں کے نتیجے میں نکلا ہوا کچرا مٹی سمیت نیچے گرا دیا۔ اس بزرگ کے سر پر وہ مٹی وغیرہ گر گئی تو فرمانے لگے:

"خداوندا تیرا شکر ادا کرتا ہوں! میرے سر پر تو ایسے گناہوں کا بوجھ ہے کہ اگر پتھر بھی پھینکے جائیں تو وہ نہ اترے! تو کتنا مہربان ہے کہ مجھ پر تو نے نرم خاک پھکوا دی!"

رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں آپ سب نے سنا یا پڑھا ہو گا کہ ان کے سر پر بار بار کوڑا کرکٹ پھینکا گیا۔ کانٹے ان کی راہ میں بچھائے گئے۔ کبھی پائے کی ہڈی ان کی پنڈلی پر ایسے ماری گئی کہ پنڈلی سے خون جاری ہو گیا۔ کبھی اونٹ کی آنتیں ان کے گلوئے مبارک میں ڈال دی گئیں اور کبھی تو آنتوں سے برآمد ہونے والی کثافت ان پر پھینکی گئی!

لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان حرکتوں کے جواب میں دعا ہی دیتے رہے اور فرماتے رہے **اللھم اھد قومی انھم لا یعلمون** "خدایا! میری قوم کو ہدایت فرما۔ یہ لوگ نادان ہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہمیشہ یہ چاہتے رہے کہ ان کی وجہ سے ان کی امت پر عذاب نازل نہ ہو۔

ہم سب کو چاہئے کہ اسوۂ پیغمبرؐ کو اپنا لیں۔ خاص طور پر علماء میں برداشت کا مادہ زیادہ ہونا چاہئے۔ معاشرے میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو اسلام کے خلاف اور ان کے اسلامی مزاج کے خلاف ہوتی ہیں۔ علماء کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ دلوں میں گھر کرنے کا ایک طریقہ تحمل بھی ہے۔ دلوں میں گھر ہو گا تو لوگ بھی باآسانی بات مانیں گے۔ جبکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غصہ کرنے کا نتیجہ الٹا نکلتا ہے اور لوگ مزید ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔

غصہ ایک طرح کی دیوانگی ہے

ایک صحرانشین قبیلے کا سردار رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ملنے آیا تھا۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس نے عرض کیا: **یا رسول اللہ علمنی** "اے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: **اذھب ولا تغضب** (سفینۃ البحار، جلد ۲، صفحہ ۳۲۰) "جاؤ اور غصہ نہ کرو۔" قبیلے کا سردار کہتا ہے کہ یہ نصیحت میں نے ذہن نشین کرلی۔

جب وہ اپنے قبیلے میں پہنچا تو کیا دیکھا کہ غیر معمولی حالات ہیں۔ لوگ اس

کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قبیلے کے کسی آدمی کے ہاتھوں دوسرے قبیلے کا آدمی مارا گیا ہے۔ اور دوسرا قبیلہ جنگ کے لئے تیار ہے۔

پہلے تو وہ سردار اپنی جاہلانہ غیرت کے مارے مسلح ہو کر قبیلے والوں کے ساتھ نکلا۔ لیکن دوسرے لشکر کے سامنے پہنچ کر اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نصیحت یاد آگئی۔ اس نے فوراً اپنا سارا اسلحہ اتار دیا اور رکھ دیا۔ عام سے لباس میں وہ دشمن قبیلے کی طرف تنہا پیدل چل پڑا۔ یہ دیکھ کر دوسری طرف والوں نے اس پر ہتھیار نہیں آزمائے۔ قریب پہنچ کر اس نے دشمن قبیلے کے سردار کا نام لیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر وہ کہنے لگا:

"یہ جنگ آخر کس لئے ہے؟ اگر آپ کا آدمی مارا گیا ہے تو کسی دوسرے کو قتل کرنے سے وہ زندہ نہیں ہو جائے گا! آپ خونبہا لے لیجئے۔ اس کے علاوہ بھی آپ جو چاہیں گے میں دے دوں گا۔ اس پیشکش کے باوجود اگر آپ چاہتے ہیں کہ جان کے بدلے جان جائے تو میں حاضر ہوں! مجھے اپنے آدمی کے بدلے میں قتل کر دیجئے! اس طرح جنگ کر کے نسل در نسل خون بہاتے رہنے سے کیا فائدہ!"

یہ دیکھ کر دشمن قبیلے کا سردار بہت متاثر ہوا۔ اس سے پہلے ان لوگوں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے بھی انسانیت کی راہ اختیار کی نہ صرف یہ کہ خون بہا طلب نہیں کیا بلکہ معاف کر کے صلح و دوستی کا ہاتھ بھی بڑھا دیا!

آپ نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نصیحت **لا تغضب** یعنی غصہ نہ کرو کتنی زیادہ کارآمد ثابت ہوئی اور جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہونے سے پہلے رک گیا۔

☆☆......☆☆......☆☆

ساتواں درس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غصّے کی اقسام

ہماری بحث غصے کے موضوع پر چل رہی تھی۔ ممکن ہے کہ غصہ انسان کو تباہی کی راہ پر لے جائے اور اسے درندہ بلکہ اس سے بدتر بنا دے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے **ان شر الدواب عنداللہ الصم البکم الذین لا یعقلون** (سورۂ انفال ۸ آیت ۲۲) "خدا کے نزدیک جانوروں سے بدتر وہ لوگ ہیں جو گونگے بہرے بنے رہتے ہیں اور سمجھ سے کام نہیں لیتے۔"

البتہ غصے کی دو قسمیں ہیں۔ شیطانی غصہ اور رحمانی غصہ۔ جو غصہ انسان کو حیوان سے بدتر بنا دیتا ہے وہ شیطانی غصہ ہے۔ البتہ جو غصہ حکم خدا کے مطابق ہوتا ہے وہ انسانیت کے اصولوں سے نہیں ٹکراتا۔ ایسے غصے کو ہم رحمانی غصہ کہہ سکتے ہیں۔ ایسا غصہ معاشرے کے لئے خیر کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ برکتوں کا باعث قرار پاتا ہے۔ اور شر کی راہ میں رکاوٹ بن کر اسے روکتا ہے۔

کبھی غصہ ضروری ہو جاتا ہے

جیسا کہ عرض ہوا، غصہ انسان کی ایسی حالت کو کہتے ہیں جو اس پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی چیز یا کام دیکھ لیتا ہے۔ اس کا خون جوش مارنے لگتا ہے اور وہ اس کو درست بنانے یا راہ سے ہٹانے کے لئے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور جب یہ کام ممکن نہیں ہوتا تو وہ انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے۔

البتہ آدمی کو دنیا میں اگر غصہ نہ آئے تو اس کے لئے زندہ رہنا دوبھر ہو جائے۔ البتہ زندگی کے حالات مناسب اور گوارا بنانے کے لئے غصے کا صحیح

استعمال جاننا بہت ضروری ہے۔ انسان میں غصے کا ہونا لازمی ہے۔ غضب کی قوت کے ساتھ ساتھ شہوت کی قوت کا ہونا بھی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ یہاں "شہوت" سے مراد نعمتوں کی خواہش ہے۔ کھانے پینے کی اشتہا ہو گی تو آدمی اس سلسلے میں تگ و دو اور کوشش کرے گا۔ ازدواجی زندگی کی خواہش ہو گی تو زندگی کا نظام مناسب ڈگر پر چلے گا اور نسل انسانی پھیلے گی۔ اسی طرح "غضب" سے مراد نعمتوں کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کا جذبہ ہے۔ اگر انسان میں غیظ و غضب کا یہ جذبہ نہ ہو تو وہ ایسی رکاوٹوں کو راہ سے ہٹا نہیں سکے گا۔

لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ غضب کی قوت حیوانیت کی راہ میں استعمال نہیں ہونی چاہئے۔ انسانیت اور شریعت کے عین مطابق ضروریات زندگی حاصل کرنے میں استعمال ہونی چاہئے۔ عقل کے عین مطابق نامناسب رکاوٹوں کو راہ زندگی سے ہٹانے میں صرف ہونی چاہئے۔ پس غضب کے صحیح یا غلط ہونے کی کسوٹی عقل و شریعت ہے۔ جو غضب عقل و شریعت کے خلاف ہو وہ شیطانی غصہ ہے۔ ناپسندیدہ غصہ ہے۔ لیکن اگر کوئی آپ پر ظلم کرنا چاہتا ہو اور آپ غصے میں اگر اسے ظلم کرنے سے روکتے ہیں یا روکنے کی کوشش کریں تو یہ رحمانی غصہ ہے۔ خدائے رحمان و رحیم کی مرضی کے عین مطابق ہے۔ پسندیدہ غصہ ہے۔

البتہ ہر چیز کی ایک معقول حد ہوتی ہے۔ اگر اتفاق سے ایک آدمی آپ سے ٹکرا جائے اور آپ کو چوٹ لگ جائے تو اس پر غصہ کرنا معقول نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے جان بوجھ کر آپ کے خلاف یہ حرکت نہیں کی۔ وہ تو جانور ہوتا ہے جو سمجھ نہیں پاتا کہ اسے جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی ہے یا انجانے میں لگ گئی ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا کردار

ایک مرتبہ امام زین العابدین علیہ السلام کے پاس کچھ مہمان آئے ہوئے تھے اور کھانے کا اہتمام ہو رہا تھا ایک غلام جلدی جلدی کباب سے بھری ہوئی ایک تیار گرم گرم سیخ مہمانوں کے لئے لا رہا تھا کہ وہ سیخ امام زین العابدین علیہ السلام کے ایک چھوٹے فرزند کے سر پر اچانک گر پڑی۔ اس کا نتیجہ آخر کار یہ نکلا کہ وہ ننھا سا بچہ مر گیا۔ غلام امامؑ کے سامنے بہت پشیمان کھڑا تھا۔ اس نے امامؑ کو راضی کرنے کے لئے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ایک سو چونتیس پڑھنی شروع کی۔ **والکاظمین الغیظ**۔ یعنی "متقی وہ ہیں جو غصہ پی جاتے ہیں۔" ابھی وہ یہیں تک پہنچا تھا کہ امامؑ نے فرمایا' "میں نے اپنا غصہ پی لیا"۔

پھر غلام نے آیت مزید آگے پڑھی۔ **والعافین عن الناس**۔ "متقی وہ ہیں جو لوگوں کو معاف بھی کر دیتے ہیں۔" یہ سن کر چوتھے امامؑ فرمانے لگے' "میں نے تمہیں معاف کر دیا۔"

پھر غلام نے آیت اختتام تک پہنچائی۔ **واللہ یحب المحسنین**۔ "خدا نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔" اتنا سننا تھا کہ امام زین العابدینؑ نے فرمایا: "میں نے تمہیں آزاد بھی کر دیا۔"

کبھی عقل کچھ کہتی ہے اور دل کچھ کہتا ہے۔ ایسے موقع پر عقل کی بات مان لینی چاہئے اور دل کی بات پر عمل نہیں ہونا چاہئے۔ یقیناً یہ غصہ پی جانے کا موقع تھا۔ غلام نے جان بوجھ کر سیخ بچے پر نہیں گرائی تھی اور عمداً اس کی جان نہیں لی تھی۔

ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ بچوں سے گھر میں برتن ٹوٹ ہی جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ماں باپ ان پر غصہ کرتے ہیں اور کبھی انہیں مارتے پیٹتے بھی ہیں۔ بچوں کا کام غلط نہیں ہے البتہ ماں باپ کا یہ کام غلط ہے۔ بچے جان بوجھ کر برتن نہیں توڑتے۔ ان کا دھیان تو بس کھیل میں لگا ہوتا ہے اور اسی دُھن میں برتن

کبھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ غیر ارادی طور پر ایک آدمی کے ہاتھوں کسی دوسرے کا نقصان ہو جائے تو دوسرا آدمی ضبط سے کام لے اور غصہ نہ دکھائے۔ اس لئے کہ اس نے جان بوجھ کر نقصان نہیں پہنچایا۔

بیجا غصہ کرنے کے کئی مواقع ہماری نظر سے گزرتے ہیں۔ بعض لوگ محض کسی کے خلاف افواہ سن کر ہی خود پر اپنا غصہ نکالنے لگتے ہیں حالانکہ افواہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ بعض لوگ تو اتنے شدت پسند ہوتے ہیں کہ محض افواہ کی بنیاد پر اپنے دل میں بغض اور کینہ پیدا کر لیتے ہیں۔ الغرض بے جا غصہ' کسی بھی وجہ سے ہو' سخت ناپسندیدہ اور شیطانی فعل ہے۔

توقع کا پورا نہ ہونا

بیجا غصے کا ایک اور موقع جو بہت دیکھنے میں آتا ہے توقع کا پورا نہ ہونا ہے۔ جب آدمی کی توقع کسی شخص سے پوری نہیں ہوتی تو وہ اس شخص پر غصہ اتارنے لگتا ہے۔ مثلاً آدمی اپنے دوست سے توقع رکھتا ہو کہ وہ ایک ہزار روپے قرض تو اسے دے ہی دے گا۔ لیکن مانگنے پر اس کا دوست انکار کر دیتا ہے تو اسے غصہ آ جاتا ہے۔ یہ غصہ بیجا اور شیطانی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت منقول ہے کہ "میرے شیعوں کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو کسی سے حاجت طلب نہ کریں۔"

امامؑ کے اس فرمان کی علت معلوم ہے۔ کسی سے حاجت طلب کرنے کی نتیجے میں ممکن ہے کہ حاجت پوری نہ ہو اور طلب کرنے والے کو غصہ آ جائے۔ اگر غصہ نہ بھی آئے تب بھی کم از کم دل پر کچھ برا اثر تو پڑتا ہے۔ کبھی اس کا نتیجہ بغض و کینہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو وقتی غصے سے زیادہ خطرناک ہے۔

البتہ معاشرے میں ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔ کبھی دوسرے سے کچھ چیز یا مدد مانگنے کی بہت ضرورت ہو اور دوسرا انکار کر دے اور

انکار کی وجہ بھی بتائے تو اسے سچ سمجھنا چاہئے۔ اگر وجہ نہ بھی بتائے تو بھی دل
کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرلینا چاہئے۔ یہ سوچنا چاہئے کہ شاید اس کے پاس
وہ چیز نہیں ہے۔ یا شاید خود اسے اس چیز کی ضرورت ہے۔ یہ سوچ لینا چاہئے
کہ آخر اسے دینا واجب تو نہیں تھا۔ بیجا غصے سے بچنے کا ہر راستہ تقویٰ اور
پرہیزگاری کا راستہ ہے۔

پرہیزگاری

ابان ابن سوید نامی راوی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے
پوچھا **ما الذی یثبت الایمان فی قلب العبد؟** "مومن بندے کے دل میں
ایمان کس طرح برقرار اور دائمی رہ سکتا ہے؟" **قال**۔ امامؑ نے فرمایا: **الذی
یثبتہ فیہ الورع و الذی یخرجہ منہ الطمع** (سفینۃ البحار جلد ۲، صفحہ ۹۳)
یعنی: "مومن بندے کے دل میں جو چیز ایمان کی برقراری اور اس کے دوام کا
سبب بنتی ہے وہ پرہیزگاری ہے اور جو چیز مومن کے دل سے ایمان نکال دیتی
ہے وہ طمع ہے۔"

مومن کو چاہئے کہ وہ خدا ہی کو کام نکالنے والا اور بگڑی بنانے والا سمجھے۔
خدا ہی کو مسبب الاسباب قرار دے۔ تمام بندوں کو جن سے عام طور پر اس کا
کام نکلتا ہے اسباب یعنی وسیلہ سمجھے۔ اگر کسی ایک وسیلے سے کام نہ نکلے تو یہ
تصور کرکے مطمئن ہو جائے کہ خدا نے اسے وسیلہ بنانا نہیں چاہا ہے۔ خدا کوئی
اور وسیلہ فراہم کردے گا۔ میرا کام تو بس اپنی حد تک کوشش کرنا ہے اور
حجت تمام کرتے رہنا ہے۔ **بیدہ الخیر**۔ خدا ہی کے ہاتھ میں خیر ہوتا ہے۔
بندوں کی بھلائی خدا سے بہتر اور کوئی نہیں چاہتا۔ بندوں پر انحصار کرنا اور یہ
سمجھنا کہ اگر فلاں بندے نے اس کا یہ کام نہ کیا تو کوئی دوسرا نہیں ملے گا،
شرک کی طرح ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ میں ایک خدا کو ماننے والا ہوں
اور مجھے چاہئے کہ اپنے کسی عمل اور معاملے میں خدا کو فراموش نہ کروں۔

غصے سے بچنے کا طریقہ

غصے سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ بندوں سے توقع نہ رکھی جائے۔ بس خدا
ہی سے امیدیں وابستہ رکھی جائیں۔ جب بندوں سے توقع ہی نہ ہوگی تو گلہ شکوہ
بھی نہیں ہوگا اور غصہ بھی نہیں آئے گا۔ خدا سے لگائی ہوئی امید اگر پوری
نہیں ہوگی تو مومن یہی سوچے گا کہ یقیناً اس میں مصلحت نہیں ہوگی۔ اس
طرح اسے غصہ نہیں آئے گا۔ بلکہ وہ خدا کا شکر بجا لائے گا کہ میں تو اپنی
مصلحت اتنی نہیں جانتا جتنی خدا جانتا ہے۔ خدا کتنا مہربان ہے کہ مجھ نادان کی
بیجا توقع سے بڑھ کر اسے میری مصلحت عزیز ہے۔

البتہ بندوں سے اتنا لا تعلق بھی نہیں ہونا چاہئے کہ کام نکالنے والے اور
وسیلہ بننے والے شخص کا مومن شکریہ بھی ادا نہ کرے۔ شکر اور شکریہ میں
فرق ہے۔ شکر بس خدا کا ہوتا ہے اور شکریہ بندگان خدا کا حق ہے۔ بلکہ ایک
حدیث میں یہاں تک ہے کہ **اشکو کم للہ اشکر کم للناس** (سفینۃ البحار، جلد
۱، صفحہ ۷۰۹) یعنی: "تم میں سب سے زیادہ خدا کا شکر ادا کرنے والا وہ ہے جو
لوگوں کا سب سے زیادہ شکریہ ادا کرتا ہو۔"

شکریہ کسی کا ادا کرتے ہیں تو اسے بندہ خدا اور خدا کا وسیلہ سمجھتے ہوئے
ادا کرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے اسے ہمارا کام نکالنے کے لئے وسیلہ
بنایا اور اس نے وسیلہ بننا قبول کیا۔ خدا کا شکر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ کام نکال
دیتا ہے اور بگڑی بنا دیتا ہے۔ جبکہ بندوں کا شکریہ یہ سمجھ کر ہوتا ہے کہ وہ خدا کا
وسیلہ بننا قبول کر لیتے ہیں۔ ورنہ اگر بیچ سے خدا کا تصور ہٹا لیا جائے تو یہ شرک
جیسا گناہ ہے۔ ایسی غلط فکر ہی غصے کا سبب بنتی ہے جب توقع پوری نہیں ہوتی۔
لیکن جب بندوں کو خدا کا وسیلہ سمجھا جائے اور کسی وسیلے سے کام نہ نکلے تو غصہ
نہیں آتا۔ مومن کو ایسی صورت میں غصہ نہیں آنا چاہئے۔ وہ تو یہ سمجھ کر
مطمئن ہو جاتا ہے کہ اگر کام نکالنے میں خدا کی مصلحت ہوگی تو یہ وسیلہ نہ سہی،

خدا کوئی اور وسیلہ فراہم کرے گا۔ اور اگر کام نہ نکالنے میں خدا کی مصلحت ہو گی تو بھی ہر لحاظ سے بھلا ہی بھلا ہے۔

ظالم کے خلاف غصہ

ایک غصہ جو کرنا چاہئے اور جو خدا کی مرضی کے عین مطابق ہے وہ ظالم کے خلاف غصہ ہے۔ مثلاً یہی صدام ملعون ہے جس نے مسلمانوں کی سرزمین پر تجاوز کیا اور سرحدوں کا لحاظ نہ رکھا۔ ہم مسلمانوں کے خلاف خونریز جنگ اس نے خود چھیڑی۔ بیشمار جانوں کے تلف ہونے کا سبب بنا۔ آقائے باقر الصدرؒ اور ان کی بہن کو قتل کر دیا اور یہ اتنا بڑا ظلم و جرم ہے کہ اگر کوئی اور ظلم اس نے نہ کیا ہو تب بھی دنیا بھر کے مسلمان صرف اسی ایک ظلم پر غضبناک ہو سکتے تھے۔

ظلم کی طرح کھلم کھلا گناہ دیکھ کر بھی اس کے کرنے والے پر غصہ کرنا خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔

ظلم و گناہ کے مقابل میں غصہ البتہ اسی حد تک کرنا چاہئے جتنا مناسب ہو۔ ظلم و گناہ جتنا بڑا ہو گا اس کے خلاف غضب و غصہ بھی اتنا ہی زیادہ ظاہر ہونا چاہئے۔

مثلاً ایک عورت سر کے بال نامحرم مردوں سے نہیں چھپاتی۔ ایک شخص کھلے عام سب کے سامنے شراب پیتا ہے۔ اور ایک شخص ایسا ہے جو کسی کو ناحق قتل کر دیتا ہے۔ یہ تینوں برابر نہیں ہیں۔ کھلے عام شراب پینا' بے پردگی کے گناہ سے زیادہ بڑا گناہ ہے' اور قتل کرنا شراب خوری سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ پس غصہ بھی اسی تناسب سے ہونا چاہئے۔

یہی بات شرعی حدود میں رہتے ہوئے انتقام لینے کی بھی ہے۔ اگر کسی نے خدانخواستہ آپ کو ناحق ایک تھپڑ مار دیا ہو تو آپ کو ایک سے زیادہ تھپڑ مارنے کا یا اس سے زیادہ زوردار تھپڑ مارنے کا حق نہیں ہے۔ تھپڑ مارنا تو بعض

موقعوں پر مثلاً بچوں کو سزا دینے یا کسی کو امر بالمعروف' نہی عن المنکر کرنے کی غرض سے جائز بھی ہوتا ہے جبکہ اس کے بغیر چارہ نہ ہو لیکن جو کام بہر صورت گناہ ہیں ان میں برابر کا بدلہ کسی لحاظ سے جائز نہیں ہوتا۔ مثلاً گالی کے جواب میں گالی اور تہمت کے جواب میں تہمت جائز نہیں ہے۔

البتہ جہاں انتقام کا مسئلہ آتا ہو وہاں بہرحال معاف کر دینا بہتر ہے۔

در عفو لذتی است کہ در انتقام نیست

(معاف کر دینے میں جو لذت ہے وہ انتقام لینے میں نہیں ہے۔)

البتہ ہر چیز اپنی حد میں درست ہے

انتقام کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ شرعی قاضی کے رُوبرُو گئے بغیر ہی لوگ ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے مجاز ہوں۔ مثلاً اگر کسی نے ایک پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگائی ہو تو اسے قاضی کوڑے لگوائے گا۔ اگر کسی نے کسی کا دانت توڑ دیا ہو تو وہ اس کا دیہ قاضی کے فیصلے کے مطابق ادا کرے گا۔ ایک نے اگر دوسرے کو ایسا تھپڑ مارا ہو کہ اس کا گال سرخ ہو گیا اور طیش میں آکر دوسرے نے اتنا زوردار تھپڑ مار دیا کہ پہلے والے کا گال سیاہ پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یعنی شریعت کے مطابق قاضی سے پوچھ کر ایک خاص مقدار میں سونا دینا پڑے گا۔ اس موقع کے تفصیلی احکام علم فقہ کی بڑی کتابوں میں موجود ہیں۔

وہ شخص حیوان ہے جو اعتدال اور شریعت کی حدود کا خیال نہیں رکھتا۔ اپنے غصے کو اعتدال کی حد میں نہیں رکھتا۔ اور کبھی تو حد سے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ جنگلی بھیڑیے کی طرح کسی کو قتل کر بیٹھتا ہے۔

یہاں تک کے بیان سے معلوم ہوا کہ غضب کی قوت اچھی چیز ہے بشرطیکہ وہ موقع محل کی مناسبت سے ہو اور اعتدال کی یعنی مناسب حد میں ہو۔ فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۱۹۴)

یعنی "جس نے تمہارے ساتھ دشمنی کی تم بھی اس کے ساتھ ویسی ہی دشمنی کر سکتے ہو جیسی اس نے تمہارے ساتھ کی۔" البتہ متقی لوگ وہ ہیں جو **والکاظمین الغیظ** (غصہ ضبط کرنے والے) اور **والعافین عن الناس** (لوگوں کو معاف کر دینے والے) ہوں۔ (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۳۴)

خدا ترس بندے کی پہچان

ابن فہد حلیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ:

دو آدمی ایک دوسرے پر غصہ اتار رہے ہوں اور آپ یہ جانچنا چاہیں کہ وہ صحیح معنوں میں خوف خدا رکھتے ہیں یا نہیں تو اس کا ایک طریقہ ہے۔ آپ ایسا کیجئے کہ جس کو پہلے جانچنا ہو اسے اپنی طرف متوجہ کیجئے۔ اس سے کہئے کہ بھائی خدا کے لئے دوسرے شخص کو معاف کردو۔ اگر وہ خوف خدا رکھتا ہوگا تو فوراً ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اور اگر وہ آپ کی بات پر اعتنا نہ کرے اور مزید جھگڑا بڑھانا چاہے تو آپ اس کے ہاتھ میں اس کی توقع کی خلاف مناسب مقدار میں رقم رکھ دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ البتہ امتحان ہو جائے گا کہ وہ خدا ترس ہے یا ایک آیہ شریفہ کا مصداق بنتے ہوئے **اخلد الی الارض** (سورۂ اعراف ۷ آیت ۱۷۶) یعنی دنیا پرست ہے۔

شیخ بہائی فرماتے ہیں کہ اہل علم حضرات اور مولوی لوگوں کو یہ آیت یاد رہنی چاہئے تاکہ وہ دنیا پرستی میں مبتلا نہ ہوں:

تلک الدار الاخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین (سورۂ قصص ۲۸ آیت ۸۳) "یہ آخرت کا گھر تو ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کردیں گے جو زمین پر نہ سرکشی کرنا چاہتے ہیں اور نہ فساد اور حقیقت بھی یہی ہے۔ بہرحال بہتر انجام تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔"

اس آیہ شریفہ میں **لا یریدون علوا** کے الفاظ موجود ہیں۔ یعنی جو زمین پر سرکشی نہیں کرنا چاہتے۔ یہ نہیں فرمایا کہ **لا یعلون** یعنی یہ نہیں فرمایا کہ جو

زمین پر سرکشی نہیں کرتے۔ سرکشی کرنا تو در کنار، سرکشی کرنے کی خواہش تک وہ نہیں رکھتے۔ آخرت کا گھر ایسے لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ گھر سے مراد ایسا مقام ہے جہاں آدمی کسی تکلیف کے بغیر سکون سے رہ سکے۔ اور سرکشی سے مراد دوسروں پر شہرت وغیرہ میں برتری حاصل کرنا ہے۔ جو شخص ایسا چاہتا ہے وہ اہل علم نہیں جاہل ہوتا ہے۔ حقیقت دنیا سے ابھی تک ناواقف ہوتا ہے۔ آخرت کی حقانیت اور ہمیشگی کا اسے بھرپور یقین نہیں ہوتا ہے۔ ایسا شخص جاہل نہیں تو اور کیا ہے؟ **هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون** (سورۂ زمر ۳۹: آیت ۹) "کیا جاننے والے اور نہ جاننے برابر ہیں؟" جی ہاں اہل علم ہی اولوالالباب ہوتے ہیں۔ صاحبان عقل و خرد ہوتے ہیں۔ ایسے ہوتے ہیں جو ہر حال میں، خواہ کھڑے ہوں یا بیٹھے، خواہ چل پھر رہے ہوں یا لیٹے ہوں، ہر حال میں خدا کو یاد رکھتے ہیں۔ **الذین یذکرون اللہ قیما و قعودا و علی جنوبهم** (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۹۱)

ایسے لوگ اگر دنیا اور آخرت میں ٹکر ہو جائے تو عقلمندی سے کام لیتے ہیں اور آخرت کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی دوراندیشی کا تقاضا ہے۔ لیکن جن لوگوں کی فکر محدود ہوتی ہے اور دنیا سے آگے جنہیں کچھ نظر نہیں آتا، یا اتنا مبہم نظر آتا ہے کہ دنیا کے سوا کچھ سوجھتا نہیں ہے، ایسے لوگ اپنی ذات اور اپنی حیوانیت ہی تک محدود رہتے ہیں۔ خدا کو یاد رکھنا تو بڑی بات ہے، وقتی طور پر خدا کو ایسے لوگ یاد بھی نہیں کرتے۔

غصے پر قابو پانا

غصے پر قابو پانے سے مراد یہی ہے کہ غصہ شیطانی نہ بن جائے۔ ورنہ رحمانی غصہ تو باعث نزول رحمت ہوتا ہے۔ در راہ آخرت ہوتا ہے۔ رحمانی غصہ خدائے رحمان کی خاطر ہوتا ہے۔ اور جو چیز خدائے رحمان کی خاطر ہو اس کے سلسلے میں انسان خود ہی خوف خدا پیش نظر رکھتا ہے۔

آٹھواں درس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہوت کی قوّت

غضب کی قوت کی طرح انسانی بدن میں شہوت کی قوت بھی ہوتی ہے۔ یہ دونوں قوتیں دنیا میں انسانی زندگی کے برقرار رہنے کا باعث بنتی ہیں۔ پہلے عرض ہوا کہ شہوت سے مراد محض جنسی خواہش نہیں ہے۔ شہوت سے مراد وہ قوت ہے جو انسان منفعت، لذت یا نعمت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ پس کھانا کھانے کی اشتہا اور پیٹ بھرنے کی خواہش بھی شہوت کی اصطلاح میں شامل ہے۔ اگر انسان میں کھانے کی خواہش نہ ہوگی تو وہ روزی حاصل کرنے کی فکر نہیں کرے گا۔ اور اس طرح ممکن ہے کہ وہ مرجائے۔

شہوت کی قوت کی طرح غضب کی قوت سے مراد محض غصہ نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ قوت جو انسان خود کو نقصان سے بچانے کے لئے استعمال کرے غضب کی قوت کہلاتی ہے۔

جنسی قوت بھی انسانی نسل کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اگر جنسی میل ملاپ کی خواہش نہ ہوگی تو انسان شادی نہیں کرے گا۔ مرد و زن ایک دوسرے کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ انسانی نسل باقی نہیں رہے گی بلکہ زندگی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

قوتوں کا درست استعمال

غضب کی قوت بھی اسی طرح ضروری ہے۔ اگر انسان میں قہر و غضب نہ ہو تو جان و مال و ناموس زد پر ہوگی پھر بھی وہ کچھ نہیں کرے گا۔ مال و دولت اور ناموس و عزت کے سلسلے میں لاپرواہی اختیار کرے گا۔ اس کے نتیجہ یہ نکلے گا کہ خواہشیں بے لگام ہو جائیں گی۔ جب رکاوٹ اور مزاحمت نہ ہوگی تو ہر

طرح کا جرم و ظلم پھیلے گا اور بڑھے گا۔ اس طرح بھی معاشرتی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

قوت خواہ شہوت کی ہو یا غضب کی، دونوں کا درست استعمال انسانی زندگی کے لئے انتہائی اہم ہے۔ درمیانی راہ بہترین راہ ہے۔ استعمال میں اعتدال کا طریقہ بہترین طریقہ ہے۔ دونوں قوتوں میں سے کسی قوت کی کمی بھی مناسب نہیں ہے اور زیادتی بھی نامناسب ہے۔ تفریط یعنی کمی بھی غلط ہے اور افراط یعنی زیادتی بھی غلط ہے۔ محض دنیا کو دیکھنا اور آخرت کو نہ دیکھنا بھی غلط ہے۔ محض آخرت کی اپنے خام خیالی کے مطابق فکر کرنا اور دنیا میں لاگو ہونے والے معاشرتی اور انسانی فرائض کو نظرانداز کردینا بھی غلط ہے۔

اب یہ کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں کام کس حد میں مناسب ہے؟ اس کا ذریعہ اور اس کی کسوٹی عقل و شریعت ہے۔ عقل کا فیصلہ، شریعت کا حکم، اور ضمیر کا فرمان ہمیشہ درمیانی راستہ دکھاتا ہے۔ غضب و شہوت کے دو گھوڑوں کے زور پر چلنے والی زندگی کی بگھی اسی طرح راستے سے ادھر یا ادھر ہٹنے نہیں پاتی۔ سیدھی راہ پر اور صراط مستقیم پر مسافر یعنی انسان کو لئے چلی جاتی ہے۔

میانہ روی

اگر آدمی غضب و شہوت کی قوتوں کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرے یا ضرورت سے کم استعمال کرے، تو دونوں صورتوں میں وہ سیدھی راہ سے ہٹ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ بھٹک جاتا ہے اور بہرحال حکم خدا کی نافرمانی ہو جاتی ہے۔ جبکہ فرمان خدا ہے: **و ان ھذا صراطی مستقیما واتبعوہ و لا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ** (سورۂ انعام ٦ آیت ١٥٣) "یہ سمجھ لو کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلے جاؤ، اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستے سے بھٹکا کر تتر بتر کردیں گے۔"

افراط و تفریط کی درمیانی حد پر چلتے رہنا چاہئے۔ یہی صراط مستقیم ہے۔

قیامت کے دن جو پل صراط ہو گا اسے بخوبی وہی پار کر سکے گا جو دنیا میں صراط مستقیم پر چلتا رہا ہو گا۔ لیکن جو شخص سیدھے راستے سے ادھر یا ادھر ہو کر چلے گا وہ آخرت میں بھی پل صراط پر باقی نہیں رہ سکے گا۔

افراط کی صورت میں بھی گر پڑے گا اور تفریط کی صورت میں بھی واصل جہنم ہو گا۔ وہاں جو مصیبت ہو گی وہ دنیا میں بے لگامی اور بے راہ روی اختیار کرنے کا نتیجہ ہو گی۔ **وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم** (سورۂ شوری ۴۲ آیت ۳۰) "جو مصیبت تم پر پڑتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کا کیا دھرا ہے۔"

خوراک میں اعتدال

قرآن مجید میں ارشاد ہے **کلوا واشربوا ولا تسرفوا** (سورۂ اعراف ۷ : آیت ۳۱) "کھاؤ پیو' البتہ کھانے پینے میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ۔" آدمی کو پیٹ بھرنے کے لحاظ سے بھی اعتدال میں رہنا چاہئے۔ ایسی صورت میں اس کی صحت برقرار رہتی ہے اور وہ کم ہی بیمار پڑتا ہے۔ اتنا ہی کھانا چاہئے اور ویسی ہی غذا استعمال کرنی چاہئے جو مناسب حد میں ہو اور مناسب ہو۔ نہ تو ضرورت سے زیادہ کھانا چاہئے اور نہ ہی ایسی غذا کھانی چاہئے جو معدے پر گراں گزرے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "جب تک تم بھوک محسوس نہ کرو کوئی چیز نہ کھاؤ۔ جب کھانا کھانے کی خواہش ذرا سی باقی رہے اور پوری طرح سیر نہ ہوئے ہو تو کھانا بند کر دو۔"

بھرے ہوئے پیٹ میں کھانا بدہضمی کا باعث ہوتا ہے اور بعض موقعوں پر خطرناک بھی ثابت ہوتا ہے۔

جس طرح ضرورت سے زیادہ کھانا ممنوع ہے' اسی طرح ضرورت سے کم کھانا بھی کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ غیر ضروری طور پر بھوک ہڑتال نقصان دہ

ہے۔ دو روزوں کے درمیان شب میں کچھ نہ کھانا نقصان دہ ہے۔ اسی لئے حکم ہوا ہے کہ دو روزوں کے درمیان آدمی کچھ نہ کچھ کھائے پیئے۔ اسی لئے سحری کا رواج ہوا ہے۔ شیخ سعدی کے ایک شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اتنا زیادہ بھی نہ کھاؤ کہ الٹی ہو جائے اور اتنا کم بھی نہ کھاؤ کہ الٹا جان پر بن جائے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ "معدہ ہر بیماری کا گھر ہے۔"

طرح طرح کی بیماریاں

انسان کو چاہئے کہ وہ انواع اقسام کے ثقیل اور دیر ہضم کھانوں کا رسیا نہ ہو جائے۔ محض زبان کی لذت کو نہ دیکھے' کچھ معدے کی راحت کا بھی خیال کرے۔ ایسی چٹ پٹی چیزوں اور مزیدار مٹھائیوں سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ ایسی چیزوں سے طاقت بڑھتی ہے۔ ایسی چیزوں سے تو بدن میں چربی کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے۔ شوگر کی بیماری ہو جاتی ہے۔ اور طرح طرح کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔

لذیذ کھانوں اور غذاؤں کی ہر دم خواہش نہ صرف بیماریوں کا باعث بنتی ہے بلکہ اخراجات میں اضافے کا سبب بھی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خواہش اتنی شدید ہو کہ آدمی اس کے لئے رقم فراہم کرنے کی دھن میں حلال و حرام کی پرواہ نہ کرے۔ طرح طرح کے جرائم میں ملوث ہو جائے اور دوسروں کے مال میں خیانت کرنے لگے۔ لیکن اگر آدمی نفس پر قابو رکھے' قناعت کرے' زبان سے زیادہ معدے کا خیال کرے تو نہ صرف یہ کہ جسمانی صحت کم خراب ہو گی بلکہ روح بھی کم آلودہ ہو گی۔

امیر شام حضرت ابوذر غفاریؓ کو بڑے بڑے لالچ دیتا تھا آسائشِ دنیا کی راہ پر لگا دینا چاہتا تھا۔ طلائی سکوں سے بھری ہوئی تھیلیاں تک ان کی خدمت میں بھیجتا تھا۔ لیکن وہ واپس کر دیتے تھے' رد کر دیتے تھے اور جو کی روٹی پر قناعت پسند فرماتے تھے۔

یقیناً جو شخص قانع ہوتا ہے، وہی صاحب عزت و عظمت ہوتا ہے۔ **عز من قنع**۔ لیکن جو شخص قناعت پسند نہیں ہوتا وہ لالچی ہو جاتا ہے۔ اگر دوکاندار ہے تو کم ناپنے تولنے یا مہنگا بیچنے لگتا ہے۔ لالچی شخص حلال و حرام کی پرواہ نہیں کرتا۔ اعتدال کی صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔ اور بھٹک کر جہنم کی راہ پر لگ جاتا ہے۔

اِفراط اور تفریط

عرض ہوا کہ جنسی شہوت دراصل شہوت والی قوت کی ایک قسم ہے۔ افراط و تفریط کسی چیز میں نہیں ہونی چاہئے۔ ہر سلسلے میں میانہ روی اپنانی چاہئے۔ انسان کو ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے کہ شادی ہی سے دور بھاگنے لگے۔ جو شخص شادی کرتا ہی نہیں وہ شرعی نقطہ نگاہ سے سخت ناپسندیدہ ہے۔ پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے **النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی**۔ یعنی "نکاح میری سنت ہے لہٰذا جو شخص میری اس سنت سے روگردانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔"

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ **تناکحوا تناسلوا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یوم القیمۃ ولو بالسقط**۔ یعنی "تم لوگ نکاح کرو اور نسل بڑھاؤ یہاں تک کہ کثرت سے ہو جاؤ کیوں کہ میں روز قیامت اس کثرت کے باعث دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔ خواہ یہ کثرت ساقط ہو جانے والے بچوں ہی کی وجہ سے کیوں نہ حاصل ہو۔"

خداوند تعالیٰ نے جنسی قوت انسانی بدن میں اس لئے رکھی ہے کہ تاکہ تاقیامت نسل انسانی چلتی رہے۔ پس اس سلسلے میں تفریط بھی نہیں ہونی چاہئے کہ کوئی شادی ہی نہ کرے۔ تفریط کی طرح افراط بھی نہیں ہونی چاہئے۔ عورت نازک اندام ہوتی ہے۔ ہر سال ایک نئے بچے کی ولادت اسے سخت زحمت میں ڈال سکتی ہے۔ بچوں سے قطع نظر جنسی عمل میں افراط نہیں ہونی چاہئے۔

معقول حد سے زیادہ ایسا عمل دہرانا مختلف بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ غیر معمولی کمزوری کا باعث ہوتا ہے اور عمر میں کمی بھی اس سے واقع ہو سکتی ہے۔

اعتدال

لہٰذا اعتدال کی راہ اپنانی چاہئے۔ نہ تو عقل و شرع کی حد سے آگے بڑھنا چاہئے اور نہ ہی اس سلسلے میں انکار کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ البتہ مختلف افراد میں جنسی قوت مختلف مقدار اور مختلف مزاج کی ہوتی ہے۔ ہر آدمی کو، ہر جوڑے کو ہم آہنگی کے ساتھ یہ دیکھنا چاہئے اور طے کرنا چاہئے کہ اعتدال کی صورت کیا ہے۔

خاندان کی تشکیل

اسلام چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اپنا ایک خاندان تشکیل دے۔ شادی کرے، شریک زندگی کو اپنا بنا کر رکھے۔ گھر کا باغ بچوں کے پھولوں سے سجائے۔ اپنی اپنی فطرت کے مطابق اور شریعت کی پیروی کرتے ہوئے آپس میں گھریلو زندگی کے لوازمات اور فرائض تقسیم کرے۔

افراط و تفریط خواہ کسی بھی سلسلے میں ہو، نہ صرف انسانی جسم کے لئے نقصان دہ ہیں بلکہ انسان کی روح بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ افراط یا تفریط کرنے والا شخص رفتہ رفتہ نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتا ہے۔ خاندانی زندگی کی برکتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور روح کو بھی ان کمالات اور درجات سے آشنا نہیں کر سکتا جو خدا نے اس کے لئے قرار دیئے تھے۔

مظلوم بنے رہنا بھی اچھا نہیں ہے

غضب کی قوت میں بھی اعتدال ضروری ہے۔ عرض ہوا کہ غصہ و غضب کا ہونا انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ یہ قوت انسان کو کمالات تک پہنچاتی ہے۔ جان و مال و ناموس کی حفاظت کرتی ہے۔ بگڑے ہوئے نفسوں اور لوگوں

کو حد سے بڑھنے نہیں دیتی۔ شہر کو جنگل کا نمونہ بننے نہیں دیتی۔ غضب کی قوت حق و باطل میں تمیز برقرار رکھتی ہے۔ حرام کو حلال سے جدا رکھتی ہے۔ البتہ شرط یہی ہے کہ یہ قوتِ اعتدال میں رہے۔

معاشرے میں اعتدال اور عدل و انصاف کی برقراری کے لئے قرآن مجید میں کتنا اچھا دستور موجود ہے کہ آدمی نہ تو ظالم بنے اور نہ ہی مظلوم بنا رہے۔ ارشاد ہے **لا تظلمون ولا تظلمون** (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۲۷۹) یعنی "نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ ہی کوئی تم پر ظلم کرے۔" مظلوم بنے رہنا بھی اچھا نہیں ہے۔ یہ تصور غلط ہے کہ بے جا تھپڑ کھانے کے باوجود بھی انسان خاموش رہے، بلکہ دوسرے تھپڑ کے لئے اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دے۔ یہ اسلامی نظریہ نہیں ہے۔ اسلام تو کہتا ہے نہ کسی کو تھپڑ مارو اور نہ کسی کو مارنے دو۔ اسلام تو اتنا حق دیتا ہے کہ تھپڑ مارنے والے کو اتنے ہی زور کا تھپڑ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے چھوٹے موٹے بدلے اور انتقام کے لئے قاضی کے پاس جانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اصول یہ ہے کہ خون نہ نکلے، کھال نہ پھٹے اور مارنے والی جگہ نیلی یا سیاہ نہ پڑ جائے۔ اس بات کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی لحاظ رکھنا چاہئے جب معاملہ اس حد تک بڑھ جائے۔ دوسری صورت میں معاملہ شرعی قاضی کے پاس گئے بغیر اپنے طور پر نہیں ہو سکتا۔

تحریف شدہ انجیل سے یہ بات نقل کی جاتی ہے اور حضرت عیسیٰؑ سے منقول ہوئی ہے کہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اپنا بایاں گال بھی مارنے کے لئے پیش کر دو۔ آج کی توریت اور انجیل کے موجودہ نسخوں میں ایسی بہت سی تحریف شدہ باتیں موجود ہیں۔ ایسی باتیں انصاف اور عدل کے خلاف ہیں۔ انسان فطری طور پر ان کو قبول نہیں کرتا۔

یہ ہم ایرانیوں پر جو جنگ مسلط کر دی گئی ہے، یہ صدام ملعون نے اپنے امریکی آقاؤں کی بات مانی ہے۔ اس جنگ پر راضی رہنا یا جنگ کا دامن پھیلنے

دینا کہاں کی معقولیت ہے اور کس انسان کی فطرت یہ گوارا کرتی ہے؟! ہم تو حکم خدا پر عمل کرتے ہیں۔ جو ہم سے لڑتا ہے ہم اس سے لڑتے ہیں۔ **وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا** (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۱۹۰) "اور راہ خدا میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ البتہ حد سے آگے نہ بڑھ جاؤ۔" پس جو ہم سے لڑ رہا ہے ہم برابر کی ٹکر سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ نہ ہم کو جنگ کے سلسلے میں کسی کا ظلم گوارا ہے اور نہ ہی ہم ناانصافی پر مبنی صلح قبول کریں گے۔ جی ہاں، یہ غضب کا موقع ہے۔ غضب کی قوت کے مناسب استعمال کا موقع ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری سرزمین کے بعض علاقوں پر قبضہ ہو جائے اور ہم دشمن کو وہاں سے ہٹانے کی فکر نہ کریں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دشمن ہم پر حملے کرے اور ہم دفاع بھی نہ کریں!

زندہ مردہ

مولا امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص گناہ دیکھ کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کرے، گناہ کا راستہ نہ روکے، اور اگر روک نہ سکتا ہو تو کم از کم دل میں اس کے خلاف غم غصہ نہ رکھے وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہے!"

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ غضب میں افراط کیا ہے۔ اب تفریط کے بارے میں عرض کرتا ہوں کہ جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں ہو لیکن پھر بھی آدمی حفاظت اور دفاع کی فکر نہ کرے تو یہ تفریط ہے۔ غضب کی قوت کا ضرورت سے کم استعمال، بلکہ غضب کی قوت کو استعمال نہ کرنا ہے۔ جس طرح غصہ کا بیجا استعمال غلط ہے اسی طرح بجا طور پر غصے کو تحریک نہ دینا بھی غلط ہے۔ جس طرح بجا طور پر جتنا غصہ دکھانا چاہئے اس کی حد سے بڑھ جانا غلط ہے، اسی طرح بجا طور پر جتنا غصہ دکھانا چاہئے اس کی حد سے پیچھے رہ جانا بھی غلط ہے۔ غنڈہ گردی کے عنوان سے کسی کو تھپڑ مار دینا اچھا نہیں ہے تو اس تھپڑ سے بچ

سکنے اور غنڈے کا ہاتھ روک سکنے کے باوجود ایسا نہ کرنا بھی غلط ہے۔ جہاں بجا طور پر ایک ڈانٹ سے کام چل سکتا ہو وہاں خوامخواہ ایک تھپڑ مار دینا بھی غلط ہے۔ اور جہاں ایک تھپڑ مار دینے سے آدمی سدھرتا ہو وہاں محض ایک ڈانٹ پر اکتفا کرنا اور آدمی کی اصلاح نہ کرنا بھی درست نہیں ہے۔

اس سے پہلے میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ایسے امور سے پرہیز کرنا چاہئے جو خوامخواہ غصے کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً کسی سے بیجا توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ جب توقع ہی نہیں ہوگی تو غصہ بھی نہیں آئے گا۔

دوسروں سے احترام کی توقع

اسی طرح دوسروں سے یہ توقع رکھنا بھی غلط ہے کہ وہ آپ کا احترام کریں۔ عالم وجود کے اہم ترین انسان حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اتنی عظمت کے باوجود ایسی توقع نہیں رکھتے تھے۔ کبھی جب ان کے آتے وقت اصحاب کھڑے ہو کر استقبال کرتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے تھے "میں راضی نہیں ہوں۔" عظیم ترین اولوالعزم پیغمبرؐ ایک دوسرے کا احترام کرنے میں خود کو دوسرے سے برتر نہیں سمجھتے تھے۔ البتہ امت کا فرض تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا شایان شان احترام کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مقصود یہی ہوتا تھا کہ لوگ سنت کی پیروی کریں۔ اسی لئے خود کو نمونہ عمل بن کر بتاتے تھے۔ بلکہ یہاں تک فرماتے رہتے تھے کہ "میں تو خدا کی جانب سے امت کا خدمت گزار مقرر ہوا ہوں، اسی لئے اس کی اجرت بھی میں خدا ہی سے لوں گا۔" **قل لا اسئلکم علیہ اجرا** (سورۂ انعام ۶: آیت ۹۰) اور سورہ شوریٰ کی آیت نمبر تیئس (۲۳) میں رسولؐ کے قرابت داروں سے مودت کو جو اجر قرار دیا گیا ہے اس کے سلسلے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرما دیا اور اس کا حوالہ آیت کی صورت میں بھی موجود ہے کہ **قل ماسئلتکم من اجر فھو لکم** (سورۂ

سبا ۳۴: آیت ۴۷) یعنی "اے رسولؐ کہہ دو کہ میں نے تم سے جو کچھ اجر رسالت طلب کیا ہے اس کا فائدہ بھی خود تم ہی کو ہوگا۔"

بس توہین نہیں ہونی چاہئے

علمائے کرام اور طلاب عزیز کو چاہئے کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کی روش کو اپنا لیں۔ ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے:۔

"پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب ابتدائے اسلام میں تبلیغ کے لئے گھر سے نکلا کرتے تھے تو ان پر پتھر برسائے جاتے تھے۔ ہڈیاں اور آلائشیں پھینکی جاتی تھیں۔ سر پر مٹی ڈال دی جاتی تھی۔ اہل علم اور اہل تبلیغ کے تمام افراد کو گھر سے نکلتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ لوگ اس پر پتھر برسائیں گے۔ لیکن جب ایسا نہ ہو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔"

واقعی اگر توہین نہ ہو تو یہ بھی غنیمت ہے۔

لوگوں سے توقع نہیں رکھنی چاہئے

خود کو امت کا اور عوام کا خدمت گزار سمجھنا چاہئے۔ یہی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔

مروی ہے کہ ایک غزوہ میں جب اصحاب غذا اور کھانا پکانے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے تو کسی نے ایک دنبہ ذبح کیا تھا تو کوئی شخص دوسرے کام میں لگا ہوا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آگ جلانے کے لئے لکڑیاں چننے اور گھاس پھوس جمع کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اصحاب ان کو کام کرتے دیکھ کر عرض کرنے لگے "ہم آپؐ کے خدمت گزار ہیں یا رسول اللہؐ! آپؐ آرام فرمایئے ہم خود لکڑیاں جمع کرلیں گے۔" یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا تھا "اگر میں خود کو تم سے زیادہ ممتاز سمجھنے لگوں گا تو میں خدا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا!" (ملاحظہ کیجئے بحار الانوار

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام جب حج یا عمرے کے لئے مدینہ منورہ سے نکلا کرتے تھے تو ایسے قافلے میں شریک ہونا چاہتے تھے جو اہل مدینہ کا ہو۔ مقصد یہی ہوتا تھا کہ راستے میں ان کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا جائے اور وہ دوسرے عام مسافروں کی طرح سفر کر سکیں۔ وہ ایسے ہم سفر کی تلاش کرتے تھے جو ان کو پہچانتے نہ ہوں۔

اس کے باوجود ایک مرتبہ ایسے ہی ایک سفر میں کسی نے امام زین العابدین علیہ السلام کو پہچان لیا۔ وہ عرض کرنے لگا "یا ابن رسول اللہ! آپ اپنا تعارف ہونے کیوں نہیں دیتے ہیں؟ حکم دیجئے تو میں ابھی تعارف کرادوں تو پھر ہم سب آپ کی خدمت کریں گے!"

یہ امام کی عظمت تھی کہ اس شخص کے اصرار کے باوجود انہوں نے تعارف کرانے سے اس شخص کو منع فرمادیا۔

امام علی رضا علیہ السلام کا کردار

کتاب **محجتہ البیضاء** میں حضرت علی رضا علیہ السلام کے حالات و واقعات میں یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

ایک مرتبہ خراسان میں امام علی رضا علیہ السلام عمومی حمام میں نہانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں ان کی مرضی کے خلاف انہیں زبردستی ولی عہد بھی بنا دیا گیا تھا۔ اندر حمام میں ایک شخص پہلے سے آیا بیٹھا تھا۔ وہ امام کو نہیں پہچانتا تھا اور دھوتی باندھے نہا رہا تھا۔ امام بھی اسی طرح نہانے لگے تو وہ کہنے لگا "کیا تم میری پشت پر کیسہ رگڑو گے؟" (یہ دستانے کی طرح موٹے دھاگے سے بنی ہوئی ایک جالی دار تھیلی ہوتی ہے جس کو ہاتھ میں پہن کر رگڑنے سے بدن کا میل دور ہو جاتا ہے۔)

حضرت نے فرمایا "ہاں، کیوں نہیں!" پھر امام علی رضا علیہ السلام نے

باقاعدہ اس شخص کی پشت پر کیسہ رگڑا۔ اتفاق سے حمام چلانے والا امام کو پہچانتا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا تو اس شخص پر اعتراض کرنے کے لئے آگے بڑھا لیکن امام نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔

بیجا توقع

خلاصہ یہ کہ اہل علم حضرات، تبلیغ کرنے والے حضرات اور راہ علم میں آگے بڑھنے والے حضرات کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ کسی معاملے میں خود کو عام لوگوں سے زیادہ ممتاز نہیں سمجھنا چاہئے۔ خود کو لوگوں کا خدمت گزار سمجھنا چاہئے۔ دوسروں سے کوئی بیجا توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ البتہ دوسروں کو بھی چاہئے کہ وہ علماء کے سلسلے میں اپنے فرائض سے غافل نہ ہوں۔ ان کا شایان شان احترام کریں۔ ان کی حوصلہ افزائی کریں۔

ہمیں دوسروں سے سلام کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت یاد رکھنی چاہئے کہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو سلام کرنے میں پہل کیا کرتے تھے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"آخر عمر تک میں تین کام نہیں چھوڑوں گا۔ سلام کے سلسلے میں پہل کرنا، خاک پر بیٹھنا اور سوار کو سواری سے اتارنا۔"

بس آج ہم نے بیجا غصے کے دو موقعوں کا ذکر کیا۔ اضطراری طور پر بے اختیاری میں کسی سے خطا ہو جائے، مثلاً بچے کے ہاتھ سے برتن چھوٹ کر ٹوٹ جائے تو اس پر غصہ کرنا بیجا ہے۔ اس طرح ایک اور موقع پر ہم نے یہ ذکر کیا کہ آدمی دوسروں سے بیجا توقع نہ رکھے۔ اس لئے کہ بیجا توقع پوری نہ ہونے کی صورت میں جو غصہ آتا ہے وہ خود بیجا ہوتا ہے۔

☆☆.....☆☆☆.....☆☆☆

نواں درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام قوتوں کو عقل و شریعت کا تابع ہونا چاہئے

ہم نے کہا تھا کہ خدائے تعالیٰ کی حکمت بے انتہا ہے۔ اس نے انسان میں شہوت اور غضب کی دو قوتیں رکھی ہیں تاکہ وہ مطلوبہ چیزیں طلب کرے اور مزاحمتوں یا رکاوٹوں کو دور کرے۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کو ایک اور قوت بھی دی ہے اور وہ عقل کی قوت ہے۔ شہوت اور غضب کی قوتیں اگر عقل کی تابع بن کر رہیں تو آدمی سعادت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ دنیا کی زندگی بھی پاک و پاکیزہ رہتی ہے اور آخرت کی ابدی زندگی بھی شاندار ہو جاتی ہے۔ عقل اگر ان دو قوتوں کو افراط و تفریط کی راہوں میں بھٹکنے سے روکتی رہے اور مہار کر کے اعتدال کی درمیانی راہ پر انہیں چلائے تو تباہی اور ہلاکت سے انسان بچ جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل کو کیسے معلوم ہو کہ اعتدال کی راہ کون سی ہے؟ اعتدال کی راہ خدا نے خود تفصیل کے ساتھ بتا دی اور سمجھا دی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے پیغمبر بھیجے ہیں، آسمانی کتابیں نازل کی ہیں آئمہ ہدیٰ منصوب کئے ہیں۔ جو لائحہ عمل اور راستے کا نقشہ بتایا ہے اسی کو ہم شریعت کہتے ہیں۔ اس کی پابندی سے عقل کو اعتدال کی راہ ملتی رہتی ہے اور خود عقل بھی بھٹکنے سے بچی رہتی ہے۔ انسان کی قوتیں اگر بھٹک جائیں تو وہ حیوان سے بد ترین بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہی آیا ہے۔ **بل هم اضل** (سورۂ اعراف: آیت ۱۷۹)

کچھ کھانے پینے کی بات

کھانے پینے کے سلسلے میں بھی نہ کمی ہونی چاہئے اور نہ زیادتی۔ اتنی کمی

بھی نہیں ہونی چاہئے کہ بدن گھل کر لاغر ہو جائے اور آدمی فرائض انجام دینے کے لائق نہ رہے۔ غذا سے بہرحال استفادہ ضروری ہے۔

آدمی غذا سے جسمانی اور روحانی دونوں طرح کے فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ جسمانی فائدے تو معلوم ہیں کہ اس سے بدن کو تقویت ملتی ہے اور آدمی زندہ رہنے کے قابل بنا رہتا ہے۔ روحانی فائدے بھی غذا سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر آدمی ہمیشہ پاک اور حلال غذا کھانے کا اہتمام کرے تو اس کا روح پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ پاک اور حلال غذا روح کو بھی پاک و پاکیزہ بنا دیتی ہے۔ ایسی غذا کا اہتمام کرنا یاد خدا سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ کھانے کا ہر ذرہ اور پینے کا ہر قطرہ جمال الٰہی کا آئینہ ہوتا ہے۔ قدرت خدا کا کرشمہ ہوتا ہے۔ ان چیزوں کو انواع و اقسام میں بارہا دیکھنے اور بار بار استعمال کرنے سے آدمی کا ذہن ان کے خالق اور رازق حقیقی تک با آسانی پہنچ سکتا ہے اور اس طرح معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ عمدہ عمدہ پھل کھانے سے آدمی ان کے خالق کی قدرت و حکمت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ محض مٹی اور پانی سے خدا نے کیسی کیسی غذائیں پیدا کر دی ہیں۔ بے شک ان تمام غذائی اجناس کا سرچشمہ خدائے قادر ہے۔ وہ خود فرماتا ہے: **و ان من شی الا عندنا خزائنه** (سورۂ حجر ۱۵: آیت ۲۱) "ہمارے ہاں تو ہر چیز کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔" پانی ایک ہی طرح کا استعمال ہوتا ہے لیکن اس سے غذائی اجناس طرح طرح کے حاصل ہو جاتے ہیں۔ **يسقى بماء واحد** (سورۂ رعد ۱۳: آیت ۴) "سب پودے ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں۔"

پس آدمی کو شکر خدا بجا لانا چاہئے کہ وہ کیسی کیسی لذتیں فراہم کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان لذتوں کو حاصل نہیں کرتا تو وہ ان کی ناشکری کرتا ہے اور خود کو محروم رکھتا ہے۔ نعمتوں اور غذاؤں پر شکر خدا بجا لانا خود غذا کا ایک روحانی فائدہ ہے کہ ان غذاؤں کے طفیل شکر کی توفیق تو ہوئی۔

عرض ہوا کہ آدمی کو کھانے پینے کے معاملے میں نہ تو نامناسب حد تک کمی کرنی چاہئے اور نہ ہی افراط سے کام لینا چاہئے۔ انسان جانوروں کی طرح بس کھانے پینے کی دھن میں نہ رہے۔ **یاکلون کما تاکل الانعام** (سورۂ محمدؐ ۴۷: آیت ۱۲) "کچھ لوگ ایسے ہیں جو جانوروں کی طرح بس کھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔" بس پیٹ بھرنے کی فکر انسان کے شایان شان نہیں ہے۔ انسان محض پیٹ بھرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کی خلقت کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ الغرض انسان کھائے پیئے' لیکن اپنے نفع نقصان کا خیال بھی رکھے۔ **کلوا واشربوا ولا تسرفوا** (سورۂ اعراف ۷: آیت ۳۱) "کھاؤ پیئو' لیکن اور اس سلسلے میں حد سے زیادہ نہ بڑھو۔"

انسان خوراک سے نہ صرف جسمانی فائدے اٹھا سکتا ہے بلکہ روحانی فائدے بھی حاصل کر سکتا ہے۔ جسم کو غذا کے ذریعے نقصان سے بچا سکتا ہے تو روح کو بھی غذا کے ذریعے آلودہ ہونے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

یاد خدا

ارشاد رب العزت ہے **ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ** (سورۂ انعام ۶: آیت ۱۲۱) یعنی "ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو۔" اس آیہ شریفہ سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ جب تک جانور کو شرعی طریقے سے ذبح نہ کیا جائے اسے نہ کھاؤ۔ اور اس سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ جب تک بسم اللہ نہ پڑھو کھانے کا آغاز نہ کرو۔ مرحوم سید ابن طاؤس جب ایک سے زیادہ قسم کی غذائیں کھاتے تھے تو ہر قسم کی غذا سے پہلے بسم اللہ پڑھا کرتے تھے۔ جانور ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا اس حد تک واجب ہے کہ اگر جان بوجھ کر ایسا نہ کیا جائے اور جانور کی گردن کاٹ دی جائے تو وہ مردار اور حرام

ہو جاتا ہے۔ سید ابن طاؤس تو یہاں تک احتیاط فرماتے تھے کہ جانور کا دودھ دوہنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لینے کا حکم دیتے تھے۔ اس طرح وہ روٹی تندور میں لگانے سے پہلے بسم اللہ کہنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ وہ ایسا دودھ نہیں پیتے تھے جس کو دوہنے سے پہلے بسم اللہ نہ کہا گیا ہو۔ اور ایسی روٹی نہیں کھاتے تھے جسے پکانے سے پہلے بسم اللہ نہ کہا گیا ہو۔

حق شناس بندہ وہی ہے جو منعم حقیقی کی یاد سے غافل نہ ہو۔ نہ صرف کھانے پینے کے معاملے میں خدا کو یاد رکھنا چاہئے بلکہ ہر نعمت کے استعمال کے موقع پر نعمت دینے والے سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

ہر چیز درمیانی حد میں اچھی ہے

ہم نے کہا تھا کہ کسی بھی سلسلے میں نہ تفریط اور کمی مناسب ہے اور نہ ہی افراط اور زیادتی اچھی ہے۔ ازدواجی تعلقات کے سلسلے میں بھی ہم نے یہی کہا تھا۔ تفریط یہ ہے کہ آدمی شادی ہی نہ کرے۔ اور افراط یہ ہے کہ آدمی جنسی ہوس پرستی میں مبتلا ہو جائے اور ضرورت سے زیادہ جنسی فعل کا رسیا ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو یہ بھی مضر ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو ذہنی اور جسمانی آرام و سکون فراہم کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ ایک خاندان کو تشکیل دیتے ہیں اور نسل آگے بڑھاتے ہیں۔ شادی کا مقصد محض جنسی تسکین نہیں ہے بلکہ اس سے اہم معاشرتی فوائد بھی ہیں۔

غضب کے موضوع میں عرض ہوا کہ تفریط یہ ہے کہ ظلم ہوتا رہے اور آدمی پرواہ نہ کرے۔ گناہ ہوتا رہے اور آدمی یہ دیکھ کر بھی بے حس بنا رہے۔ ظالم کو ظلم سے اور گنہگار کو گناہ سے نہ روکے' مظلوم کی مدد نہ کرے۔ یہ بھی غضب کے سلسلے میں تفریط اور کوتاہی ہے۔

وہ زمین میں دھنس گیا

مروی ہے کہ ایک عابد نماز میں مشغول تھا اس کی آنکھوں کے سامنے دو بچے ایک مرغے سے کھیل رہے تھے۔ اور کھیل بھی کیا تھا اسے اذیت دے رہے تھے۔ اس کے پر نوچ رہے تھے۔ مرغا چیخ رہا تھا چلا رہا تھا اور ان کے ہاتھوں میں تڑپ رہا تھا۔ لیکن عابد اپنی نماز کو طول دیئے جا رہا تھا۔ نماز پر نماز پڑھے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مرغا مر گیا۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ عابد کو مرغے کی فریاد رسی نہ کرنے کی اسی وقت سزا ملی اور وہ زمین میں دھنس گیا!

غصہ اپنی ذات کے لئے نہیں ہونا چاہئے

غضب کی قوت افراط میں بھی نہیں ہونی چاہئے۔ اگر غضب افراط میں ہو تو آدمی کی دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ بیجا غصہ ایسی چیز ہے جس کی نہ تو عقل اجازت دیتی ہے اور نہ شریعت۔ بچے سے برتن ٹوٹ جائے اور اس نے جان بوجھ کر نہ توڑا ہو تو اسے ڈانٹنا بیجا غضب ہی تو ہے۔ کسی سے بیجا توقع رکھی جائے اور توقع پوری نہ ہونے کی صورت میں اس پر اپنا غصہ نکالا جائے تو یہ بیجا غضب ہی تو ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ **و کان انا غضب لا یغضب لنفسہ**۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غصہ فرماتے تھے تو اپنی ذات کے لئے غضبناک نہیں ہوتے تھے۔ انؐ کا غصہ خدا ہی کے لئے ہوتا تھا۔ گناہ و فساد اور کفر و الحاد ہی کے خلاف ہوتا تھا۔

ایک مشہور شعر

ہمارے ائمہ علیہم السلام کی سیرت بھی یہی تھی۔ امیر المؤمنین علیہ السلام سے منسوب یہ شعر ہے جس کے مطابق انہوں نے ارشاد فرمایا۔

ولقد امر علی اللئیم یسبنی
فمضیت تمتہ قلت لا یعنینی

(ایک بے کردار آدمی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مجھے برا بھلا کہے۔ ایک دفعہ جب وہ ایسا کر رہا تھا تو میں اس کے پاس سے یہ کہتے ہوئے گزرا تھا کہ یہ میرے بارے میں نہیں کہہ رہا ہے۔ یہ باتیں مجھ سے مربوط نہیں ہیں۔)

عمروؒ ابن عبدود کے ساتھ جنگ کا حال تو آپ نے بہت سنا ہوگا۔ حضرت علی علیہ السلام جب اس پر غالب آگئے تو اس نے حضرتؑ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا تھا۔ حضرتؑ اس کا سر تن سے جدا کرنے ہی والے تھے کہ یہ حرکت ہوئی تھی۔ وہ فوراً اسے چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد پھر انہوں نے اس کا سر کاٹا تھا۔ بعد میں جب اس کی علت پوچھی گئی تھی تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا:۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں اسی وقت اس کا سر کاٹ لوں تو کہیں وہ غضب بھی میرے کام کا باعث نہ بن جائے جو میری توہین کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اگر وہ غضب بھی شامل ہو جاتا تو غضب خالص خدا کے لئے نہ رہتا۔ جہاد باطل ہو جاتا۔ جہاد تو وہی ہے جس میں کافر کو قتل کیا جائے تو خدا ہی کی خوشنودی پیش نظر ہو۔"

ایک شہید کا پیغام

ایک ماہ قبل ایک شہید کا جنازہ میدان جنگ سے شیراز لایا گیا تھا۔ ابھی حال ہی میں اس کا بھائی بھی میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا ہے۔ روانگی سے ایک رات پہلے اس نے اپنے شہید ہو جانے والے بھائی کو خواب میں دیکھا جو اس سے کہہ رہا تھا:۔

"کل جو تم میدان جنگ میں جا رہے ہو تو دیکھو انتقام کا جذبہ لے کر نہ جاؤ۔"

شہید کا یہ پیغام سب کے لئے ہے۔ شہید کو یونہی زندہ تو نہیں کہا گیا ہے۔ **احیاء عند ربھم یرزقون** (سورۂ آل عمران ۳: آیت ۱۶۹) "وہ تو زندہ ہیں۔"

اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہیں اور رزق پا رہے ہیں۔"

ایک اور شہید کا واقعہ یہ ہے کہ اس کے دفن کے بعد کی شب میں اس کے بھائی نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ اپنے شہید بھائی سے کہہ رہا تھا: "تو تو مرگیا، لیکن میں ابھی نہیں مرا ہوں۔"

شہید ہو جانے والے بھائی نے جواب میں کہا: "میں نہیں، بلکہ آپ مرے ہوئے ہیں ہم شہید لوگ تو زندہ ہیں۔"

بیجا طرفداری

غضب کے موضوع پر بحث چل رہی تھی۔ بیجا غضب کا ایک موقع بیجا طرفداری ہے۔ اپنا کوئی آدمی غلطی پر ہو اس کے باوجود اس کی طرفداری میں غصہ دکھانا بیجا ہی تو ہے۔ شرعی حکم تو یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے خواہ وہ کوئی ہو، اور ظالم کو ظلم سے روکا جائے خواہ وہ کوئی ہو۔ خواہ وہ اپنا بیٹا ہی ہو۔

جمہوری اسلامی حکومت کے خلاف جاسوسی کرنے والے کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ لیکن پارٹی بازی کرنے والے بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ اگر جاسوس کسی اور سیاسی پارٹی کا ہو تو اس کی سزائے موت کے سلسلے میں حمایت کرتے ہیں، بلکہ مطالبہ کرتے ہیں۔ البتہ خود اپنی پارٹی کا کوئی آدمی جاسوسی کے جرم میں پکڑا جائے تو واویلا کرتے ہیں اور احتجاج کرتے ہیں اور اسے چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہلاکت

سورہ فتح میں جاہلانہ تعصب کی مذمت ہوئی ہے اور ایسے لوگوں کو خدا سے بے خبر قرار دیا گیا ہے اور ایسے عمل کو کافروں کا عمل بتایا گیا ہے۔

یہ وہی عرب قومیت کا تعصب ہے جس کی بات صدام ملعون کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ہم سب عرب ہیں اور عرب قوم اپنا دفاع کر رہی ہے۔ حالانکہ

اب ظاہر ہو چکا ہے کہ اس کا عرب قومیت کا نعرہ جھوٹا تھا۔ اگر عرب اور عجم کی جنگ تھی تو پھر کیوں اس ملعون نے عربوں کو قتل کیا؟ بہت سے عربوں کو بے گھر اور بے وطن کیوں کیا؟ صوبہ خوزستان میں بسنے والے ہمارے عرب بھائیوں کو کیوں شہید کیا؟ اے صدام تو اگر جنگ کو عرب و عجم کی جنگ قرار دے رہا ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ لیکن ذرا غور تو کر کہ تو نے ہمارے عرب بھائیوں کو شہید کر کے یہ ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تیری سیاست کذب و دروغ پر مبنی ہوتی ہے۔

کسی ظالم کی مدد اور حمایت محض اس لئے کرنا کہ اس سے ہمارے روابط ہیں، وہ ہماری قوم کا ہے، وہ ہمارے خاندان کا ہے، وہ ہمارے شہر کا ہے یا وہ ہمارے محلّہ کا ہے، جاہلانہ تعصب ہے اور اس میں ہلاکت ہے۔

کچھ عرب و عجم کی بات

کتاب خصال شیخ صدوقؒ میں یہ مشہور حدیث موجود ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "چھ گروہ چھ چیزوں کی وجہ سے ہلاک ہوں گے۔ **والعرب بالعصبیتہ** اور ان چھ میں سے ایک تعصب ہے جس کی وجہ سے عرب ہلاک ہوں گے۔" رشتہ داروں میں سے کسی نے کوئی جرم کر دیا۔ اب چونکہ وہ مجرم اس کا رشتہ دار ہے لہٰذا اس کی مدد اور حمایت کی جائے گی۔ یہ بری عادت ظہور اسلام سے قبل عربوں میں تھی اور آج بھی بہت سے عرب جو اسلامی تربیت سے نا آشنا ہیں ایسا تعصب رکھتے ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: **من کان فی قلبہ حبتہ خردل من عصبیتہ بعثہ اللہ یوم القیمتہ مع اعراب الجاهلیتہ** (تفسیر نور الثقلین) "جس شخص کے دل میں بھی رائی کے دانے کے برابر بھی تعصب ہو گا خداوند عالم بروز قیامت اسے جاہل عربوں کے ساتھ محشور فرمائے گا۔"

صدام اور اس کے حامی بعث پارٹی والے چونکہ عرب ہونے کی حیثیت

سے جنگ کر رہے ہیں یقیناً اس حدیث کے مصداق قرار پاتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام تعصّب کے بارے میں فرماتے ہیں: **من تعصب او تعصب لہ فقد خلع ربق الایمان منہ عنقہ** (تفسیر نور الثقلین)

یعنی "جو شخص تعصب کرے گا یا اگر کوئی اس کی خاطر تعصب کرے اور وہ اس سے خوش ہو گا' تو ایسے شخص کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔" مثال کے طور پر آپ سے ایک جرم سرزد ہو گیا دوسرے لوگ چاہتے ہیں کہ آپ بیجا حمایت کریں اور تعصب سے کام لیں۔ اس طرح آپ کے مدمقابل کے حق کو پامال کریں۔ ایسے تعصب کرنے والے ہلاک و برباد ہو جائیں گے اور خود یہ شخص جو اپنی بیجا حمایت سے خوش ہو رہا ہے اس کے پاس بھی ایمان نام کی کوئی چیز نہیں ہے! سچ ہے پارٹی بازی اور تعصب میں معاشرے کی ہلاکت ہے اور یہ شریعت کے خلاف بھی ہے۔

یہ شریعت کے خلاف ہے

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا ارشاد ہے **العصبیتہ التی یاثم علیھا صاحبھا ان یری الرجل شرار قومہ خیر امن خیار قوم اخرین** (تفسیر نور الثقلین) یعنی "ایسا تعصب جس کی وجہ سے کوئی شخص گنہگار ہو جاتا ہے یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کے برے لوگوں کو دوسرے اچھے افراد پر ترجیح دینے لگے۔" مثلاً یہ کہ اپنے قبیلے' اپنے علاقے یا اپنے خاندان کا آدمی ہونے کے ناطے کسی کو ترجیح دے دی جاتی ہے۔ اس سے اچھے اور بہتر صلاحیت والے لوگوں کو اس کی خاطر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنا اسلام کی مقدس شریعت کے خلاف ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے دوستوں' رشتہ داروں اور اپنائیت کا اظہار کرنے والوں کے خلاف درشت رویہ اختیار کرے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ اپنے لوگوں سے اپنائیت کا

سلوک کرتا ہے اور اپنے لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جو بات بری ہے اور ناپسندیدہ ہے وہ یہ ہے کہ جب ایک اپنے آدمی اور ایک غیر آدمی میں کسی اعتبار سے موازنہ کیا جائے اور غیر آدمی اپنے آدمی سے زیادہ باصلاحیت ہو اور کام کے لئے ایسے ہی باصلاحیت آدمی کی ضرورت ہو تو پھر بھی اپنے آدمی کو ترجیح دے دی جائے۔ یہ سراسر ناانصافی ہے اور تعصب ہے۔

یہی بات لڑائی جھگڑے کی صورت میں کسی کا ساتھ دینے کے موقع پر کہی جا سکتی ہے۔ ایک روایت میں تعصب کی تعریف کچھ یوں بیان ہوئی ہے:

ھو ان یحمی قومہ و عشیر تہ او اصحابہ فی الظلم و الباطل او یلح فی منھب باطل او ملتہ باطلتہ للونہ دینہ او دین ابائہ او عشیر تہ (سفینتہ البحار جلد ۲: صفحہ ۱۹۹)

یعنی: "تعصّب یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم اور اپنے خاندان یا ساتھیوں کی ظلم اور باطل کی راہ پر ہونے کے باوجود حمایت کرے۔ تعصب یہ بھی ہے کہ آدمی کسی باطل طرز فکر یا کسی گمراہ گروہ کا محض اس لئے ساتھ دے کہ وہ طرز فکر یا گروہ اس کا اپنا کہلاتا ہے یا اس کے آباء و اجداد یا اہل خاندان کا ہوتا ہے...."

اسلام تو کہتا ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ اپنی قوم کے لوگوں' خود سے وابستہ افراد اور اپنے دوستوں کی مدد کی جائے۔ البتہ جب موازنہ کرنے اور ترجیح دینے کی بات آتی ہے تو انصاف کا بھی حکم دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ناانصافی کر جانا شریعت کے مطابق نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں **ومن جنود الحق الانصاف و ضد الحمیتہ** یعنی "حق کے لشکریوں میں انصاف ضرور ہوتا ہے جس کی ضد تعصب ہے۔"

اسلام تو کہتا ہے کہ اگر بیٹے نے ظلم کیا ہے تب بھی مظلوم کی حمایت کرنی چاہئے اگرچہ بیٹے کو سزا ہو جائے۔ **کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علی انفسکم** (سورۂ نساء ۴: آیت ۱۳۵) "اے ایماندارو مضبوطی سے انصاف پر قائم رہو اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر گواہی دو اگرچہ کہ یہ گواہی خود تمہارے اپنے ہی خلاف کیوں نہ ہو۔"

اسلامی حکومت کی خدمات

ہماری اسلامی حکومت کے قیام کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ اس کے خلاف اقتصادی بائیکاٹ بھی چل رہا ہے اور جنگ بھی سر پر تھوپ دی گئی ہے۔ جنگ کی وجہ سے بہت سے لوگ بے گھر ہو گئے ہیں۔ ضروری اشیاء میں قلت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن پھر بھی اتنی خوش اسلوبی اور جانفشانی سے کام کیا جا رہا ہے اور حالات کو سنبھالا جا رہا ہے کہ غیر معمولی حالات کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔

ان گراں بہا خدمات کے باوجود اسلامی حکومت کے خلاف مفاد پرست گروہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ مغربی یا مشرقی بلاک سے وابستہ منحرف پارٹیوں کے افراد انقلاب کی ضد میں کہہ رہے ہیں کہ حکام نے کوئی کام نہیں کیا ہے۔ حکام کی خدمات نظرانداز کر رہے ہیں اور عیب تلاش کر رہے ہیں۔ تہمتیں لگا رہے ہیں۔ اسلامی حکومت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ علماء کو حکومت سے بے ربط کر دینا چاہتے ہیں اور مملکت کو امریکہ یا روس کے حوالے کرنے کی فکر میں ہیں۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہمارے اکثر حکام غیر معمولی محنت کر رہے ہیں۔ چند گھنٹوں کے آرام سے قطع نظر وہ رات دن خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اضافی تنخواہ یا زیادہ تنخواہ کی فکر کئے بغیر وہ اپنے اوقات کار سے زیادہ کام کر رہے ہیں۔ اگر کام اور وقت کو دیکھا جائے تو آج شاید ایک معمولی مزدور کی ماہانہ آمدنی ہمارے وزراء سے زیادہ ثابت ہو۔ ایسے خدمت گزار حکام کی قدر کرنی چاہئے۔ ایسے ہمدرد افراد کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ ان کا ساتھ دینا چاہئے

اور ہاتھ بٹانا چاہئے۔ یہ کیا کہ اسلامی حکومت کو الٹا کمزور بنانے کی کوشش کچھ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ جاہلانہ سلوک اور تعصب نہیں تو اور کیا ہے!

انصاف کی اہمیت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

(قال) **سید الاعمال ثلثة** بہترین کام تین ہیں۔ یہ لفظ سفینۃ البحار (جلد نمبر ۲: صفحہ نمبر ۵۹۴) میں موجود ہے جبکہ اصول کافی میں اس کی جگہ **اشد الاعمال ثلثة** لکھا ہے۔ یعنی اہم ترین کام تین ہیں۔ باقی روایت یکساں ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں **انصاف الناس من نفسک حتی لا ترضی بشی الا رضیت لهم مثله** یعنی "تمہاری جانب سے لوگوں کو انصاف ملنا چاہئے۔ اس حد تک انصاف کہ جو چیز اپنے لئے پسند کرو ویسی ہی چیز لوگوں کے لئے پسند کرو۔"

و مئواساتک الاخ فی المال "اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ مالی امور میں ہمدردی سے تمہیں کام لینا چاہئے۔"

و ذکر الله علی کل حال "اور تمہیں چاہئے کہ ہر حال میں خدا کو یاد رکھو۔"

انسان اگر اہل انصاف نہ ہو تو وہ حیوان ہے۔ وہ حیوان ہے جو حق اور ناحق میں تمیز نہیں دیتا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم خدا کو حاضر و ناظر سمجھیں۔ دوسروں کا حق اگرچہ وہ نظریاتی اختلاف رکھتے ہوں، پامال نہ کریں بالکل اسی طرح دوسروں کے حق کا خیال رکھیں جس طرح اپنے حقوق کا اور اپنے لوگوں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نہ انصافی کی بات نہ کریں اور تعصب میں آکر کسی پر تہمت نہ لگائیں۔

جاہلانہ حمیّت، بیجا غیرت یا تعصّب کی ضد انصاف ہے۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ حق و انصاف کا دامن نہ چھوڑے۔ ظلم کا ساتھ نہ دے، بلکہ حق ہی کا ساتھ دے اگرچہ حق کسی غیر کو مل رہا ہو اور ظلم کسی اپنے کے ہاتھوں ہو رہا

ہو۔ انسان کوئی ہو اسے انصاف ملنا چاہئے۔ اور انسان کوئی ہو اسے ظلم سے روکنا چاہئے۔ ایسے موقعوں پر اپنایت اور رابطہ نہیں بلکہ حقانیت اور ضابطہ پیش نظر ہونا چاہئے۔

☆☆......☆☆......☆☆

دسواں درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پچھلے درس کا خلاصہ

پچھلے درس میں ہماری گفتگو غصے کے بارے میں یہ ہوئی کہ غصہ یا قوت غضب خداوند عالم نے انسان کی طبیعت میں رکھا ہے۔ اس قوت کو موقع محل کے لحاظ سے استعمال کرنا چاہئے۔ لیکن عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان قوت غضب کو غیر ضروری طور پر استعمال کرنے لگے یا جہاں اس قوت کے استعمال کی ضرورت ہو وہاں بھی استعمال نہ کرے۔ ایسا کرنا ایک قابل مذمت عمل ہے۔ غصے میں عدل و انصاف کا مطلب ہے کہ انسان غلط اور بری باتوں کے مقابلے میں غضبناک ہو۔ البتہ ایسی صورت میں جتنی دیر اور جس انداز سے غصہ میں آنے کی ضرورت ہے اتنا ہی غصہ کرنا چاہئے۔

وہ غصہ جس کی مذمت ہوئی' یہ ہے کہ آدمی بے اختیار سرزد ہو جانے والی غلطیوں پر غصہ کرے یا کسی سے کسی کام کی توقع رکھے اور جب وہ پوری نہ ہو تو اس پر برہم ہو جائے۔ اسی طرح اپنے ساتھ کام کرنے والے یا اپنے کسی مدمقابل سے حسد کرے اور جب بھی انہیں کوئی ترقی حاصل ہو یا کسی طرح کا کوئی اور فائدہ ہو تو ان پر برس پڑے۔ اور یہ چاہے کہ ان کی ترقی باقی نہ رہے اور فائدہ ختم ہو جائے۔ آج ہم ایسے غصے کی بابت گفتگو کریں گے جو حد اعتدال سے زیادہ شمار ہوتا ہے اور قابل مذمت ہے۔

زبان' ہاتھ اور دل

بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں غصہ کرنا صحیح ہوتا ہے لیکن حد سے' یعنی ضرورت سے زیادہ ہونے کی صورت میں یہی غصہ ناپسندیدہ قرار پاتا ہے۔ باطل کے مقابل میں ظالم کے ظلم سے نمٹنے کے لئے اور گنہگار کو گناہ سے روکنے کے

لئے غصہ کرنا چاہئے۔ غضب کی قوت استعمال ہونی چاہئے۔ زبان، ہاتھ اور دل استعمال ہونے چاہئیں۔ البتہ ہر قسم کے غصے کو ضرورت کے عین مطابق ہونا چاہئے۔ ضرورت سے بڑھ کر غضب اگر ابھار لیا جائے تو اس کا نتیجہ کبھی الٹا بھی ثابت ہوتا ہے اور نقصان دہ ہوتا ہے۔

اگر کسی نے آپ کو خواہ مخواہ برا بھلا کہا تو مومن کی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جواب میں غصہ ظاہر کرے۔ لیکن مومن کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ خاموشی اختیار کرے اور خواہ مخواہ برا کہنے والے کو معاف کردے۔ لیکن اگر آپ اس برا بھلا کہنے والے کو مارنا شروع کردیں تو یہ آپ کا حد سے بڑھ جانا ہوگا۔ زبان کا جواب زبان ہی سے مناسب ہوتا ہے۔

برائی کا جواب نیکی

اگر آپ برا بھلا کہنے والا کو کچھ کہے بغیر معاف بھی کردیں اور میٹھی زبان میں مسکراتے چہرے کے ساتھ نصیحت بھی کریں، تو یہ برائی کا جواب نیکی ہوگا۔ مثلاً آپ ہمدردی بھرے لہجے میں کہہ سکتے ہیں: "بھائی، آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ شریف انسان ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں آپ کا احترام ہے۔ آپ ایسی بات کر کے اپنی شخصیت کو نہ گرائیں۔" **لا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ ولی حمیم** (سورۂ حم سجدہ ۴۱ آیت ۳۴) یعنی: "بھلائی اور برائی کبھی برابر نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا سخت کلامی کا ایسے طریقے سے جواب دو جو نہایت اچھا ہو۔ ایسا کرو گے تو تم دیکھو گے کہ جس شخص سے تمہاری دشمنی تھی وہ گویا اب تمہارا گہرا دوست بن گیا ہے۔"

ایسے واقعات کتنے اچھے لگتے ہیں۔ کسی نے آپ کو برا کہا تو آپ نے بڑا دل کرتے ہوئے پیار بھرے انداز میں اسے نصیحت کی۔ آپ کی ضرورت کے وقت وہ کام نہیں آیا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کی ضرورت کے وقت آپ کام آگئے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف یہ کہ دشمنی ختم ہوجاتی ہے بلکہ گہری دوستی میں بدل

جاتی ہے۔ البتہ اتنا بڑا دل کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ جو بڑے اونچے درجے کا ایمان رکھتے ہیں اور نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل ہوتے ہیں یہ انہی کا کام ہوتا ہے۔ **وما یلقھا الا الذین صبروا وما یلقھا الا ذو حظ عظیم** (سورۂ حم سجدہ ۴۱ آیت ۳۵) یعنی: "یہ کمال انہی کو حاصل ہے جو صبر کرنا جانتے ہیں اور یہ کمال انہی کو حاصل ہے جن کا ایمان و عمل بہت اعلیٰ ہے۔"

ایسا کرنے کا فائدہ

اگر لذت ترک لذت بدانی
دگر لذت نفس لذت نخوانی

اگر یہ جان لیں کہ لذت ترک کردینے میں کیا لذت ہوتی ہے تو پھر آپ کو نفسانی خواہشات کے پورا ہونے سے حاصل ہونے والی لذت، لذت نہیں معلوم ہوگی۔ اگر آپ ایسے بننا چاہتے ہیں تو یہ ابتداء میں ایک دشوار کام لگے گا لیکن رفتہ رفتہ آپ کو اسی میں مزہ آنے لگے گا۔ آپ کا دل اسی طرح ٹھنڈک محسوس کرے گا۔ آپ کا دماغ اسی طرح سکون پائے گا۔ آپ جب دیکھیں گے کہ آپ کو برا بھلا کہنے والا آپ کے حسن سلوک کی وجہ سے گرویدہ ہوگیا ہے تو آپ کو ایسی خوشی حاصل ہوگی جو کسی اور طرح حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ ترکی بہ ترکی جواب دینے سے، تلخی کے جواب میں تلخی ظاہر کرنے سے دل کی بھڑاس تو نکل جاتی ہے لیکن وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی جو معاف کردینے سے اور دشمن کو دوست بنا لینے سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر فرض کیا بدی کے جواب میں نیکی کا نتیجہ ایسا نہ نکلے۔ اگر فرض کیا اس طرح دشمن آپ کا گرویدہ نہ ہوجائے، تب بھی آپ کو خوشی اور سکون کا احساس ہوگا۔ اور یہ سکون دل کی بھڑاس نکال دینے کے بعد والے سکون سے بڑھ کر ہوگا۔ آپ کو اپنی شرافت اور عظمت خود مزہ دینے لگے گی۔

شرعی حد میں انتقام

معلوم ہوا کہ کمال، بدی کے جواب میں نیکی کرنا ہے۔ کمال کا ایک چھوٹا درجہ یہ بھی ہے کہ بدی کے جواب میں نہ تو نیکی کی جائے اور نہ ہی برابر کا بدلہ لیا جائے۔ اور انصاف یہ ہے کہ بدی کے جواب میں برابر کا بدلہ لے لیا جائے۔ شرعی حدود میں رہتے ہوئے انتقام لے لیا جائے۔ انتقام اگر شرعی حد میں ہو تو یہ عدل و انصاف سے ہٹ کر نہیں ہے اور شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ اگر کسی نے آپ کو احمق کہہ دیا اور آپ نے جواب میں کہہ دیا کہ "احمق تو تم ہو۔" تو یہ شرعی حد میں رہتے ہوئے برابر کا انتقام ہے۔ اس لئے کہ احمق کہنا گالی نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی نے آپ کو گالی دی تو آپ وہی گالی جواب میں اسے نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ گالی دینا حرام ہے۔ معلوم ہوا کہ انتقام کی اجازت اسی وقت ہے جب وہ برابر کا ہو اور شرعی احکام کی پابندی کرتے ہوئے لیا جائے۔
فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم (سورۂ بقرہ ۲: آیت ۱۹۴) "پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے ویسی ہی زیادتی تم بھی اس پر کر سکتے ہو۔"

البتہ بدلہ یا انتقام لینے کی ہر صورت میں اجازت نہیں ہے۔ بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن کا بدلہ قاضی یعنی شرعی حاکم کی موجودگی یا اجازت کے بغیر لیا نہیں جا سکتا۔ مثلاً زخم کے جواب میں زخم نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے لئے شرعی عدالت میں حاضری اور قاضی کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔ پاک دامن عورت پر کسی نے بدکاری کی تہمت لگائی ہو تو تہمت لگانے والے پر یا اس کی کسی رشتہ دار عورت پر ایسی تہمت جواب میں نہیں لگائی جا سکتی۔ ایسی تہمت کا جواب بہت مشکل ہے۔ چار عادل آدمیوں کی گواہی شرعی قاضی کے سامنے ضروری ہے۔ بصورت دیگر انتقام نہیں لیا جا سکتا۔ البتہ بدکاری کی تہمت لگانے والے کو عادل گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں شرعی سزا دلوائی جا سکتی ہے۔
غصہ کی حالت میں زبان، ہاتھ اور دل کو قابو میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

تاکہ شرعی حد سے تجاوز نہ ہو جائے۔ خود پر غضب کے عالم میں قابو پانے کے لئے خوف خدا کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر خوف خدا نہ ہو تو آدمی غضب کے عالم میں حد اعتدال سے آگے بڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سورۂ فتح میں ارشاد ہے کہ

سورہ فتح میں ارشاد ہے کہ **انجعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیتہ حمیتہ الجاھلیہ فانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ و علی المومنین و الزمھم کلمتہ التقوی و کانوا احق بھا و اھلھا و کان اللہ بکل شی علیما** (سورۂ فتح ۴۸: آیت ۲۶)

یعنی "جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد ٹھان لی تھی اور ضد بھی جاہلیت کی سی تو خدا نے اپنے رسولؐ اور مومنین کے دلوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر قائم رکھا۔ یہ لوگ اسی کے سزاوار اور اہل بھی تھے۔ اور خدا تو ہر چیز سے خبردار ہے۔"

ہم نے پہلے بیان کیا کہ اسلام پھیلنے سے پہلے اور ابتدائے اسلام کے زمانے میں عرب لوگوں کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی تھی۔ شیطانی غصہ، بیجا ضد اور جاہلانہ تعصب ان کی عادت بنا ہوا تھا۔ روایت کے مطابق تعصب ہلاکت کا موجب ہوتا ہے۔ وہ لوگ آنکھ بند کر کے باطل کی حمایت کرتے تھے۔ اپنے علاقے اور قبیلے کی بیجا طرفداری بھی گویا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور ان معاملات میں حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ مذکورہ آیہ شریفہ میں خداوند تعالیٰ مومنین کو تسلی دے رہا ہے تاکہ وہ اپنے غضب پر قابو پائے رہیں اور فساد کی آگ جاہلیت کے جنگل میں پھیل نہ جائے۔ اسی لئے خداوند تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید بھی فرما رہا ہے۔ تقویٰ یعنی خوف خدا غضب کی سرکشی پر آمادہ گھوڑے کو بھی رام بنا دیتا ہے۔ اعتدال کی صراط مستقیم سے ہٹنے نہیں دیتا اور کسی حرام کام کا موجب نہیں بننے دیتا۔

صلح حُدیبیہ

مذکورہ آیہ شریفہ صلح حدیبیہ سے متعلق ہے۔ اس کی تفصیل اسلامی تاریخ کی کتابوں میں آپ کو مل جائے گی۔ ہم صرف اپنے موضوع سے مربوط ہوتے ہوئے اس سے استفادہ کریں گے۔

جب صلح نامہ لکھنے کی بات طے پائی تو قریش کے مشرکوں کا نمائندہ سہیل ابن عمرو قرار پایا۔ طے ہوا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خود صلح کا متن تیار کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صلح کا متن لکھوایا اور حضرت علی علیہ السلام نے لکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:۔

"لکھو **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**" حضرت علیؑ نے لکھ دیا۔ سہیل نے کہا:

"ہم رحمان اور رحیم کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے ہمیں ایسا کوئی نام نہیں سکھایا۔ پس یہ نہیں لکھنا چاہیے۔" کچھ مسلمان غضبناک ہو گئے اور زور دینے لگے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ضرور لکھا جائے گا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود سہیل سے پوچھا:۔

"اچھا تو پھر ہم کیا لکھیں؟"

سہیل نے کہا: "اب تک ہماری رسم چلی آرہی ہے کہ ہم **بسمک اللھم** لکھتے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ

"یہ جملہ مٹا دو اور **بسمک اللھم** لکھ دو۔"

اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت اور بہتری اسی میں تھی کہ جنگ نہ ہو اور صلح سے کام چل جائے۔ خواہ پورا **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** لکھا جاتا، خواہ **بسمک اللھم**، دونوں صورتوں میں اللہ کا نام تو آیا۔ کسی بت کا نام تو نہیں لکھنا پڑا۔ غیر ضروری طور پر اظہار غضب سے اسلام اور مسلمانوں کو اتنی سی بات پر خطرہ میں

ڈالنا معقول نہیں تھا۔

محمدؐ ہر حالت میں پیغمبر ہیں

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "لکھو محمد رسول اللہ اور سہیل ابن عمرو کے درمیان قرارداد۔"

سہیل ابن عمرو نے اعتراض کیا: "اگر ہم تم کو اللہ کا رسول سمجھتے ہوتے تو تم سے جنگ نہیں کرتے۔ پس لفظ رسول اللہ مٹاؤ۔" اس بات پر بھی اصحاب غضبناک ہو گئے اور قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جائے۔

لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "ٹھیک ہے اسے مٹا دو۔" علی علیہ السلام نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! آپ کے رسول خدا ہونے کا عنوان میں کیسے مٹا دوں؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قلم خود اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کا لفظ محو کر دیا۔ ظاہر ہے کہ لفظ رسول اللہ ایک کاغذ پر مٹانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا منصب رسالت تو ختم نہیں ہوتا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی خاطر جنگ کی جاتی۔ ظاہر ہے محمدؐ ہر حالت میں پیغمبر ہی رہتے ہیں اور ایک قلم کی زد میں لفظ رسول آجانے سے رسالت تو زد میں نہیں آتی تھی۔

عُلماء اور مِلت

آج کل ایران میں منحرف پارٹیوں کے لوگ آزادی سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسلامی انقلاب کے رہبروں اور اسلام کے پرچم داروں، یعنی علماء کی توہین کر رہے ہیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ علماء نے ملت کا کیا بگاڑا ہے؟ علماء نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کون سا ظلم یا جرم کیا ہے؟ تم علماء کو ہر چیز کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ انقلاب سے پہلے کے زمانے میں اور انقلاب سے بعد کے زمانے میں کتنا فرق آگیا ہے! علماء نے کب اقتدار کی ہوس کی ہے؟ صرف کچھ علماء نے

عہدے سنبھالے ہیں تو وہ بھی دراصل کرسی نہیں، بلکہ ذمہ داری سنبھالی ہے۔ تم کو تو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ وہ شب و روز انتھک محنت کر رہے ہیں۔ اپنی پرواہ کئے بغیر اسلامی انقلاب کا دفاع کر رہے ہیں۔ کسی مادی لالچ کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ علماء تو ملت کے خدمت گزار ہیں۔ وہ نہ تو اقتدار کے بھوکے ہیں اور نہ ہی خود پرستی یا شہرت کی طلب انہیں ہے۔

ہمیں چاہئے کہ جاہلیت کی جیسی باتوں سے پرہیز کریں۔ جاہلیت کے جواب میں غضبناک ہونا اور جاہلیت اختیار کرنا مومنین کو زیب نہیں دیتا۔ ہمیں پرسکون رہنا چاہئے۔ سورہ فتح کی جو آیت تلاوت کی گئی اس میں بھی خدا مؤمنین کو پرسکون رہنے کی تاکید فرما رہا ہے۔

پُرسکون رہنا

مومن وہی ہے جس کا ملکہ تقویٰ ہو۔ تقویٰ جس کی سرشت بن چکا ہو۔ مومن وہی ہے جو ہمیشہ خدا کو حاضر و ناظر سمجھتا رہے۔ ہر وقت اس کے ذہن میں یہ خیال رہے کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ ایسا ہی شخص اپنے غضب پر اور اپنی قوت شہوت پر بھرپور قابو رکھ سکتا ہے۔ ایسا ہی شخص غصہ کرتا ہے تو بھی خدا کے لئے غصہ کرتا ہے۔ غضب کی رو میں بہہ نہیں جاتا۔ کبھی اپنی ذات کی خاطر غصہ نہیں کرتا۔

آپ حضرت محمد مصطفیٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی سیرت دیکھ لیجئے۔ مشرکوں کے نمائندے سہیل ابن عمرو نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی توہین کی اور ان کے نام مبارک کے آگے سے رسول اللہ کا لفظ مٹانے پر زور دیا۔ آپ رسول اللہؐ کی سنت دیکھئے کہ وہؐ پرسکون رہے اور خود اپنے دست مبارک سے یہ لفظ مٹا دیا۔ باطل کے مقابلے کا ایک طریقہ پرسکون رہنا ہے۔ صبر کی ڈھال استعمال کرنا ہے۔ اور اس طرح اسلام و مؤمنین کو خطرات سے بچا لینا ہے۔ مومنین کی تعریف میں ارشاد خداوندی ہے: **و اذا خاطبھم الجاھلون**

قالوا سلاما (سورۂ فرقان ۲۵: آیت ۶۳) یعنی "جب جاہل جہالت کی بات کرتے ہیں تو صبر کرنے اور پرسکون رہنے والے مومنین کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو۔"

سلام، سَلَمَ سے ہے۔ سلامتی سے ہے۔ مُسلِم اور اسلام بھی اسی سے نکلے ہیں۔ اسلام، سلامتی کا دین ہے۔ کسی جاہل کی نامناسب بات پر بگڑ کر خون خرابہ کرنا اسلام نہیں سکھاتا۔ اگر صلح حدیبیہ کے موقع پر کچھ لوگوں کی اشتعال انگیزی رنگ لاتی تو وہ رنگ خون کا رنگ ہوتا۔ مسلمانوں کے خون کا رنگ جبکہ مسلمانوں کی تعریف یہ ہے کہ **المسلم من سلم المسلمون من یدہ و لسانہ**۔ "مسلمان تو وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں۔"

اعضاء و جوارح کو پرسکون رکھنا

غضب کی قوت کو کسی لحاظ سے بے قابو نہیں ہونے دینا چاہئے۔ بلکہ بہتر ہے کہ غیر ضروری طور پر اسے ابھرنے نہ دیا جائے۔ اگر کوئی شخص بیجا طور پر آپ کو طمانچہ مار دے تو بہتر یہی ہے اور تقویٰ سے قریب تر یہی ہے کہ آپ برابر کا بدلہ نہ لیں، بلکہ اسے معاف کر دیں۔ **و ان تعفوا اقرب للتقوی** (سورۂ بقرہ ۲: آیت ۲۳۷) "اگر تم بخش دو تو پرہیزگاری سے بہت قریب ہے۔"

یہ نہیں کہنا چاہئے کہ اگر میں نے ایک کو معاف کر دیا تو دوسروں کو شہ ملے گی اور وہ بھی بیجا طمانچہ ماریں گے۔ ایسا بہت ہوا ہے کہ طمانچہ مارنے والے یا ظلم کرنے والے کو معاف کر دینے سے وہ شرمندہ ہو گیا ہے۔ اس نے توبہ کر لی ہے اور اس کی اصلاح ہو گئی ہے۔ اس کی دنیا اور آخرت سدھر گئی ہے۔ ایسا بھی بہت دیکھا گیا ہے کہ معاف کر دینے والے کی عظمت کے قائل ظالم شخص کے علاوہ دیگر اشخاص بھی ہو گئے ہیں۔ معاف کر دینے والے کی عزت و عظمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اس کی بھی دنیا اور آخرت میں بہتری پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ اعضاء و جوارح پر انسان غضب کے عالم

میں پوری طرح قابو نہیں رکھ سکتا۔ طمانچے کے جواب میں اسی انداز کا اور اتنے ہی زور کا طمانچہ مارنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی احتیاط سے کام لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ظالم بن جائے۔ تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی معاف کر دے۔

ظلم کی روک تھام

خداوند تعالیٰ مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے ایک جگہ فرما رہا ہے: **لا تظلمون ولا تظلمون** (سورۂ بقرہ ۲: آیت ۲۷۹) "ایسا طرز عمل اختیار کرو کہ نہ تو تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ اور نہ ہی کوئی تم پر ظلم کر سکے۔"

ہو سکتا ہے اس آیہ شریفہ کو دیکھتے ہوئے آپ کے ذہن میں ایک سوال ابھرے۔ اور وہ یہ کہ اگر میں طمانچہ مارنے والے کو معاف کر دوں گا تو اس آیہ شریفہ پر عمل نہیں ہو گا۔ میں مظلوم قرار پاؤں گا اور دوسرا یونہی بچ جائے گا۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ یہ آیت **لا تظلمون ولا تظلمون** ابتداء ہی سے ظلم کی روک تھام سے متعلق ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کو طمانچہ مارنا چاہے اور ظلم کی ابتداء کرنا چاہے تو اسلام یہ نہیں کہتا کہ اپنا گال پیش کر دیجئے کہ لو بھئی طمانچہ مارو۔ عقل بھی ایسی بات کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ اگر آپ کو پہلے سے علم ہے کہ فلاں شخص آپ کو طمانچہ مارنے والا ہے تو آپ کو دفاع کرنا چاہئے۔ خود کو اس طمانچے سے بچانا چاہئے۔ ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے کہ نہ تو آپ ظالم قرار پائیں اور نہ ہی کوئی آپ پر اپنے ظلم کی ابتداء کر سکے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام کا ارشاد ہے: **ان المومن یموت کل میتۃ غیر انہ لا یقتل نفسہ فمن قدر علی حقن دمہ ثم خلی عمن یقتلہ فھو قاتل نفسہ** (سفینۃ البحار، جلد ۲، صفحہ ۴۰۷)

یعنی: "مؤمن کو ہر انداز سے موت آ سکتی ہے۔ البتہ مؤمن ایسی موت نہیں مرتا کہ وہ اپنے آپ کو خود قتل کرے۔ اسی بنیاد پر اگر کوئی شخص اپنی جان بچا

سکتا ہو اور قاتل کا قتل کرنے والا ہاتھ پکڑ سکتا ہو، لیکن پھر بھی وہ اپنے قاتل کو جو وہ کرتا ہے کرنے دے تو وہ خود کو قتل کرنے والا شمار ہو گا!"

ہمارا موضوع اور معاف کر دینے کا موضوع یہ ہے کہ آپ پر ظلم ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں معاف کر دینا برابر کا بدلہ لینے سے بہتر ہے۔

و ان تعفوا اقرب للتقوی۔ اگر تم معاف کر دو تو یہ معاف کر دینا تقویٰ سے زیادہ قریب فعل ہے۔ برابری اور عدالت کے ساتھ بدلہ لینے سے بہتر ہے۔ اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں ذکر ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو زخمی کر دے تو اسے تین چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہو گا۔ یا تو معاف کر دے۔ یا تو دیہ (دیت) وصول کرے۔ یعنی قاضی کے حضور میں ایک خاص حد تک زخم کے عوض رقم لے لے۔ اور تیسری صورت قصاص کی ہے۔ یعنی شرعی حاکم کے حضور میں برابر کا زخم لگائے یا لگوائے۔ یہ کام سخت مشکل ہے۔ اگر سوئی کی نوک کے برابر بھی زخم زیادہ لگا دیا تو پہلے والے کو اس کا بھی انتقام لینے کا حق حاصل ہو جائے گا!

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے غلام قنبر کو ایک مرتبہ کسی شخص پر حد جاری کرنے یعنی ایک مخصوص تعداد میں کوڑے مارنے کا حکم ہوا تھا۔ بھولے سے قنبر نے ایک عدد تازیانہ زیادہ مار دیا تھا۔ اگرچہ عمداً ایسا نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی حضرت علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ قنبر ایک تازیانہ کھالیں۔ پھر اسی مجرم نے جسے ابھی سزا ملی تھی قنبر کو ایک تازیانہ مار دیا!

معلوم ہوا کہ برابری کے ساتھ قصاص پر عمل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ معاف کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ تقویٰ سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اگر معاف نہ کرنا چاہے تو آدمی دیہ (دیت) وصول کر لے۔ یہ بھی قصاص سے بہتر ہے۔

تھپڑ کے سلسلے میں ایک مسئلہ بیان کر دوں۔ آپ کو حق نہیں ہے کہ ایک زوردار تھپڑ کے عوض میں دو ہلکے تھپڑ لگا دیں، یا دو ہلکے تھپڑ کے ذریعے بدلہ

لیں۔ برابری کا اس حد تک لحاظ ضروری ہے کہ جیسا کیا گیا ہے بدلہ بھی ویسا ہی ہو تعداد کے علاوہ کیفیت میں بھی یکسانیت ضروری ہے۔ اگر کسی نے آپ کو ایسا تھپڑ لگایا ہے کہ آپ کا گال سرخ ہو گیا ہے تو آپ جواب میں ایسا تھپڑ نہیں لگا سکتے کہ اس کا گال سیاہ پڑ جائے۔ اگر آپ نے اس کا گال سیاہ کر دیا تو اس کو دیہ (دِیَت) لینے کا حق حاصل ہو جائے گا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کس حد تک مشکل کام ہے۔ اور ہم سے تھپڑ کی طرح کے کئی کام سرزد ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں خود پر قابو پانا چاہئے اور تقویٰ کی خاصیت کو اپنانا چاہئے۔

کچھ دل کی بات

زبان اور ہاتھ کی حد تک تو بات ہو گئی۔ اب ذرا کچھ دل کی بات ہو جائے۔ دل کے لحاظ سے بھی غضب کی قوت اعتدال میں رہنی چاہئے۔ اگر کسی نے دشمنی کے بغیر آپ پر کوئی ستم کیا ہے تو آپ اسی حد تک بدلہ لینے کا حق رکھتے ہیں۔ دشمنی، بغض اور کینہ اپنے دل میں پیدا کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ اس کی موت کی آرزو کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ اس کی پریشانی پر خوش ہونے کا حق شریعت نے آپ کو نہیں دیا ہے۔ حسد کرنے کا حق آپ کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے خلاف کوئی بری نیت رکھنے کا حق بھی آپ کو نہیں ہے۔ کسی مسلمان کے خلاف دل میں برا ارادہ بھی رکھنا ایک گناہ ہے۔ کسی کے خلاف ناانصافی کرتے ہوئے دل میں غصہ رکھنا بھی گناہ ہے۔

آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ دل پر قابو نہیں حاصل ہو پاتا ہے۔ یہ آپ کی کوتاہی اور کمزوری ہے یہ آپ کے دل کا گناہ ہے۔ کینہ اور حسد کا شمار دل کے گناہوں میں ہوتا ہے۔ ایسے گناہوں سے بچنے کا طریقہ شریعت نے بتا دیا ہے۔ ہمیں اس پر عمل کرنا چاہئے۔ دل پر قابو پانے کی مشق کرنی چاہئے۔ اس موضوع کو ہم نے اپنی کتاب "قلب سلیم" میں دوبارہ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

گیارہواں درس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حسد

غصے کی طرح حسد کے بارے میں بھی روایتوں میں بہت کچھ موجود ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس مہلک روحانی اور معنوی بیماری کے بارے میں غور کریں کہ آخر یہ کیوں پیدا ہوتی ہے۔ اور جب اس کے اسباب معلوم ہو جائیں تو پھر خود کو اس سے بچانا چاہئے۔ بغض و کینہ اور حسد انسان کی روح کو اسی طرح تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں جس طرح کینسر جسم کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ گھروں کو ویران کر دینے والی اس بلا سے خود کو محفوظ رکھے۔ حسد بیجا غصے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس سلسلے میں بہت سی مثالیں پہلے ہی بیان کی جا چکی ہیں۔ کسی ساتھ میں کام کرنے والے کی ترقی ہو گئی تو بس غصہ آگیا اور تکلیف پہنچ گئی۔ مدمقابل آفیسر بن گیا اور وہ خود پیچھے رہ گیا تو بس غصے میں لال پیلے ہو گئے کہ اسے کیوں ترقی مل گئی۔ یہ غصہ ہی تو ہے جو بغض و کینہ کا سبب بنتا ہے اور انسان تمام عمر حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اب اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اندر ہی اندر جلنے لگتا ہے۔ اور یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کا دشمن اپنے مقام و منصب سے محروم اور تباہ و برباد ہو جائے۔ حسد کی یہ کیفیت جو اس پر طاری ہوتی ہے جسم اور روح دونوں کے لئے خطرناک ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ **العجب لغفلة الحساد عن سلامة الاجساد** (نہج البلاغہ) یعنی "ان حسد کرنے والوں پر تعجب ہے کہ وہ کیوں اپنے جسموں کی سلامتی سے غافل ہیں!" اسی طرح ایک اور مقام پر حضرتؑ فرماتے ہیں **صحة الجسد من قلة الحسد** "بدن کی صحت و سلامتی، حسد نہ کرنے یا کم کرنے میں ہے۔" مولائے کائناتؑ کا یہ ارشاد گرامی بالکل

درست ہے۔ طبّی نقطہ نظر سے بھی یہ بات واضح ہے کہ انسان کا نفس سیکڑوں کاموں کو انجام دیتا ہے اور انہی کاموں میں سے ایک کام بدن کے نظام کو چلانا اور قوائے جسمانی کی حفاظت بھی ہے چنانچہ جب آدمی حسد کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کے حواس جسمانی کسی سے جلنے میں لگے ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کا اثر حسد کرنے والے کے پورے جسم پر پڑتا ہے اور اس کا نظام ہاضمہ بھی متاثر ہوجاتا ہے۔

خوراک اور حسد

آپ نے سنا ہوگا اور شاید کسی کو دیکھا بھی ہوگا کہ آدمی جب غصے کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کی بھوک مرجاتی ہے۔ اور اگر سمجھانے بجھانے سے کچھ کھا بھی لے تو بڑی بے دلی سے کھاتا ہے۔ کھانا کھانے کے دوران اگر اسے غصہ آجائے یا کوئی ناپسندیدہ کام اس کے سامنے ہونے لگے تو وہ صحیح طرح سے کھانا نہیں کھاسکتا ہے اور جو کچھ کھاتا ہے وہ ٹھیک سے ہضم بھی نہیں ہوپاتا۔ ایسے موقعے پر لوگ کہتے ہیں کھایا پیا خاک میں مل گیا۔ یعنی غذا سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان پہنچا۔ آدمی اگر خوشی خوشی کھائے تو غذا اس کے جسم میں لگتی ہے ورنہ وہی غذا اس کے لئے وبال جان بن جاتی ہے۔ ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوپاتی ہے اور جسم بیمار ہوکر کمزور ہوجاتا ہے۔

حسد کرنے والوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اب ان کا جسم صحت مند نہیں رہ پائے گا۔ بہت سی بیماریاں حسد کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص خود کو حسد سے بچائے گا تو نہ صرف یہ کہ اس کا جسم صحت مند اور سلامت رہے گا بلکہ اس کا ایمان بھی محفوظ رہے گا۔

حسد اور ایمان

کتاب اصول کافی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

الحسد یاکل الایمان کما تاکل النار الحطب "حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو جلا کر خاک کردیتی ہے۔" آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح سے حسد ایمان کی روح کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آگ میں جل کر لکڑی کس طرح آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح سے کسی شخص کا ایمان بھی حسد کی وجہ سے آہستہ آہستہ ختم ہوجاتا ہے۔ اور حسد کرنے والا اگرچہ کہ نماز و روزے کا پابند ہی کیوں نہ ہو جب اس دنیا سے اٹھتا ہے تو ایمان نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں ہوتی!

ایک اور حدیث نبویؐ میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: **قد دب الیکم داء الامم من قبلکم وھو الحسد لیس بحالق الشعر لکنہ حالق الدین** (سفینۃ البحار، جلد ۱، صفحہ ۲۵۱) "اس مرض سے بچو جس میں گزشتہ امتیں مبتلا ہوگئیں تھیں کہیں وہ مرض تم میں بھی نہ پیدا ہوجائے۔ وہ مرض حسد ہی تو تھا! حسد نہ صرف یہ کہ تمہارے اعمالوں کو تباہ کرتا ہے بلکہ تمہارے دین کو بھی برباد کردیتا ہے۔"

یہ وہ خطرناک پیغام تھا جس کا اعلان حضور اکرمؐ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اصحاب کے سامنے فرمایا۔ سابقہ انبیاءؑ کی امتیں منزل کمال و سعادت پر پہنچنے کے باوجود حسد کے باعث تباہ و برباد ہوگئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان بھی حسد ہی کی وجہ سے پیغمبرؐ کے بعد تباہی اور بربادی کا شکار ہوئے اور حسد ہی کی وجہ سے ہزاروں افراد جنگ جمل و صفین میں قتل ہوئے۔

ملت ایران کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ عظیم الشان انقلاب امام خمینیؒ کی رہبری اور مسلم اتحاد و یگانگت کا نتیجہ ہے۔ اسی انقلاب کے باعث دنیا نے آپ کو پہچانا ہے اور حیران ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ لوگ بھی حسد جیسے مہلک مرض کا شکار ہوجائیں اور خدا کی عطا کردہ یہ نعمت سلب ہوجائے۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کیجئے آپ اچھی طرح سمجھ لیں گے کہ ماضی میں مسلمان معاشرہ اور ان

کی اجتماعی زندگی آپس کے بغض و کینہ اور حسد کی وجہ سے تباہ ہوئی ہے۔ حسد کی وجہ سے گزشتہ قوموں کا کیا حال ہوا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ علماء میں بھی حسد پیدا ہو جائے۔

صاحبانِ علم و حسد

مرحوم صاحب جواہر "کتاب شہادت" میں گواہی دینے والے کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ گواہ کو حسد سے پاک ہونا چاہئے۔ اگر حسد کرنے والا گواہی دے تو اس کی گواہی کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسلام حسد کرنے والے شخص کی گواہی کو رد کر دیتا ہے۔ یعنی ایسا شخص عادل نہیں ہے بالالفاظ دیگر حسد گناہ کبیرہ ہے۔ صاحب جواہر اپنی اس بات کے ثبوت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس حدیث کو تحریر کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ چھ گروہ ایسے ہیں جو چھ چیزوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ ان میں سے ایک علماء کا گروہ ہے جن کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: **والعلماء بالحسد** "اور علماء حسد کرنے کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔" ایسے علماء جنہوں نے علم دین تو حاصل کر لیا ہے لیکن ان کا نفس برائیوں سے پاک نہیں ہو سکا ہے وہ اپنے حسد کی وجہ سے جہنمی قرار پائیں گے۔ یہ علماء کسی اور کو اپنے سے بلند مقام پر نہیں دیکھ سکتے۔ کسی دوسرے کی تعریف نہیں سن سکتے۔ اپنی ذات ہی کو سب سے نمایاں دیکھنا چاہتے ہیں اور بس!

کل امام محمد تقی علیہ السلام کی تاریخ ولادت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی گفتگو اسی مناسبت سے آگے بڑھاؤں اور نویں امامؑ کے حوالے سے روایت نقل کروں۔ البتہ یہ بھی بتا دوں کہ حدیث صرف دینی طلبہ اور علمائے فقہ کے بارے میں نہیں ہے بلکہ تمام طالب علموں کے بارے میں ہے کہ وہ حسد کی وجہ سے ہلاک ہو سکتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کبھی علم کے باعث بھی حسد پیدا ہو جایا کرتا ہے خواہ وہ علم دین ہو یا کوئی اور علم۔ مثلاً ایک ڈاکٹر بھی دوسرے ڈاکٹر سے حسد کر کے

خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ماہر فن اس بلا کا شکار ہو سکتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ مرحوم آیت اللہ خمینیؒ نے فرمایا تھا کہ دینی مدارس ہوں یا یونیورسٹیاں، اگر وہاں سے غیر تربیت یافتہ طلبہ آتے ہیں تو ان سے معاشرے میں خرابی پھیلنے کا پہلو زیادہ ہے اور فائدے کی امید بہت کم ہے۔

ایک حاسد قاضی کا واقعہ

ابولیلا قاضی کا واقعہ سننے کے قابل ہے۔ امام محمد تقی علیہ السلام کے زمانے میں یہ شخص متوکل عباسی کے دربار میں چیف جسٹس بنا ہوا تھا۔ اور اس وقت کی اسلامی حکومت کے تمام اہم فیصلے اسی کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ زرقاء نامی ایک دوکاندار اس کا پڑوسی ہوا کرتا تھا۔ قاضی اپنے اس ہمسائے کے ہاں آیا جایا کرتا تھا۔ ایک روز جب وہ اپنے اس پڑوسی کے گھر پہنچا تو اس نے یہ دیکھ کر کہ قاضی سخت پریشان ہے سوال کیا: "قاضی صاحب آج آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" قاضی نے جواب دیا "جانتے ہو آج خلیفہ کے دربار میں مجھ پر کیا مصیبت پڑی ہے؟ سنو! دربار میں ایک ایسے چور کو لایا گیا جس کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ مسئلہ حد جاری کرنے کا تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے؟ میں نے کہا قرآن میں ہے: **السارق و السارقۃ فاقطعوا ایدیھما** (سورۂ نور ۲۴: آیت ۱) "چور خواہ مرد ہو یا عورت تم دونوں ہی کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔" اسی طرح قرآن مجید کا وضو کے سلسلے میں بیان ہے: **فاغسلوا وجوھکم و ایدیکم الی المرافق** (سورۂ مائدہ ۵: آیت ۶) "اے صاحبان ایمان جب تم نماز کے لئے آمادہ ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو۔" لہٰذا چور کے ہاتھ **مرافق** یعنی کہنی سے کاٹ دیئے جائیں۔

خلیفہ نے دوسرے درباری قاضیوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کیوں کہ آیت تیمم ہے: **فامسحوا بوجوھکم و ایدیکم** (سورۂ مائدہ ۵: آیت ۶) "اور اگر تم کو پانی نہ مل سکے تو تم پاک مٹی سے اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔" لہٰذا اس

آیت کی روشنی میں چور کے ہاتھ کو کلائی کے جوڑ سے کاٹنا چاہئے۔ اب خلیفہ نے شیعوں کے امام محمد تقی جوادؑ کی طرف رخ کیا اور پوچھا: "حضور آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ "یہ قاضی حضرات تو مسئلہ بیان کر چکے!" جب خلیفہ کی جانب سے اصرار بڑھا تو امام محمد تقیؑ نے فرمایا:

"چور کی انگلیاں کاٹی جائیں گی! کیوں کہ ارشاد خداوندی ہے: **و ان المساجد للہ** (سورۂ جن ۷۲: آیت ۱۸) "مساجد یعنی وہ اعضاء جو سجدے میں زمین پر ہوتے ہیں صرف اللہ کے لئے ہیں۔" یہ چور جب نماز پڑھے گا تو اس کے بھی ساتوں اعضاء زمین پر ہونے چاہئیں۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی زمین پر رکھے گا۔ لہٰذا صرف انگلیاں کاٹی جائیں!"

یہ سن کر خلیفہ نے کہا: "بہت خوب! مرحبا! اور فوراً حکم دیا کہ امامؑ کے بتائے ہوئے مسئلہ کے مطابق چور کی انگلیاں کاٹی جائیں۔"

اے زرقاء میں اسی وجہ سے پریشان ہوں کہ پچیس سالہ نوجوان عالم (امام محمد تقیؑ) کو کیوں مجھ پر مقدم کیا گیا۔ اس کی بات مان لی گئی اور مجھے رد کر دیا گیا۔ میں پریشان ہوں اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اس جوان کو اپنے راستے سے ہٹا نہ دوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جو کوئی بھی اس جوان کو قتل کرنے میں مدد کرے گا وہ جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ لیکن پھر بھی میں ایسا کروں گا!

زرقاء نے ہر چند اسے نصیحت کی لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ اگلے دن دربار پہنچا اور خلیفہ سے کہا: "کل تم نے جو کچھ دربار میں کیا ہے اس کے بارے میں کچھ سوچا بھی یا نہیں؟ ذرا غور تو کرو! وہ شخص جسے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد امام مانتی ہے، اسے رسولؐ کا حقیقی جانشین قرار دیتی ہے اور تجھے باطل قرار دیتی ہے، تم نے دربار میں اس کی حوصلہ افزائی کی ہے! تمہیں تو چاہئے تھا کہ اس کی حیثیت کو کم کرتے مگر تم نے اسے بڑھایا ہے! اب تو وہ لوگ جو انہیں خلیفہ برحق

قرار دیتے ہیں یہی کہیں گے تاکہ خلیفہ متوکل نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے اور ان کے فتوے کو سب پر مقدم کیا ہے۔ تم نے کتنی بڑی سیاسی غلطی کی ہے!"

غرض یہ کہ خلیفہ متوکل کا اس قدر کان بھرا کہ آخر کار وہ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے قتل پر تیار ہو گیا اور انہیں زہر دے دیا۔

نفس کی تربیت

غور فرمایئے کہ علم و دانش کتنی خطرناک چیز ہے! اگر نفس کی تربیت نہ ہو تو علم کے باوجود اور عدالت عالیہ کا سربراہ ہونے کے باوجود آدمی قتل امامؑ تک کے لئے تیار ہو جاتا ہے! مجتہد ہوں یا ڈاکٹر، مکینک ہوں یا انجینئر ہر شخص تربیت نفس کے بغیر گمراہ ہو سکتا ہے۔

علم اور علماء کی مدح قرآن نے کی ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ **وورثۃ الانبیاء** "علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں۔" اور **العلماء أمناء الرحمٰن** "علماء خدائے رحمان کے امین ہیں۔"

حدیث میں ایسے علماء کو وارث انبیاءؑ اور خدا کا امین قرار دیا گیا ہے جن کے قلوب نور ایمان سے منور ہیں۔ یہ نور واقعیت اور حقائق پر مبنی علم، دنیا کے فنا ہونے اور بقائے آخرت کے علم کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ صرف پڑھنا کافی نہیں ہے۔ جب تک نفس کی تربیت نہ ہو۔ دل ایمان کے نور سے منور نہیں ہو سکتا! البتہ یہ نور ایک عطیہ الٰہی ہے خدا کی جانب سے عطا ہوتا ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایسے امور کو انجام دیں کہ خدا ہمیں یہ نور عطا فرمائے۔

حسد کا نقصان

ہماری گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ جس طرح کینسر جسم کے لئے خطرناک ہے اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر حسد کا نقصان ہے۔ البتہ حسد کا حملہ آدمی کی روح پر ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کا بدن بھی اس حملے کی زد میں آجاتا ہے۔ آج

یہ خطرہ مسلمانوں کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ بعض لوگ پڑھے لکھے ہیں' استاد بھی بن گئے ہیں' لیکن وہ حسد سے خود کو نہیں بچا پائے ہیں۔ حسد کی وجہ سے اپنے مدمقابل کے خلاف لکھتے ہیں۔ اس کی توہین کرتے ہیں۔ اس پر تہمت لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حکومت اسلامی کے بھی مخالف ہو گئے ہیں! آپ اس حکومت اسلامی کو آخر کیوں کمزور کرنا چاہتے ہیں؟ یہ حکومت آپ کو پسند نہیں؟! کیا بختیار اور ازہاری حکومت چاہتے ہیں؟!

جب آپ ولی فقیہ کی حکومت قبول نہیں کر رہے ہیں تو پھر کس کی حکومت قبول کریں گے؟ مسلمانوں کا سرپرست کسے بنانا چاہتے ہیں؟ امریکہ کو یا محمد رضا شاہ پہلوی کو؟ مسلمانوں کے امور کا نگراں یعنی ولی فقیہ کسے بنانا چاہتے ہیں؟ کیا کوئی مشرق سے وابستہ حکمراں چاہتے ہیں یا مغرب سے وابستہ؟!

بات دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ حسد میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اسی لئے جمہوریہ اسلام اور انقلاب اسلامی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس انقلاب کے حق کو ادا نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس اسلامی حکومت نے لوگوں کی فلاح و بہبود اور آبادکاری کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں اسے یکسر نظر انداز کر رہے ہیں۔ آخری اطلاعات کے مطابق سپاہ پاسداران کی طرف سے جو پمفلٹ شائع ہوا ہے اس میں تحریر ہے کہ: "اسلامی حکومت نے انقلاب کی کامیابی سے اب تک تقریباً ستر (۷۰) اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ہزاروں اسکول اور مدرسے قائم کئے ہیں۔ ہزاروں کلومیٹر سڑکیں تعمیر کی ہیں۔ متعدد ہسپتال بنوائے ہیں۔ اور اسی طرح اور بھی بہت سی خدمات ہیں۔ تقریباً تیس (۳۰) ہزار طالب علم رضاکارانہ طور پر ملک کی تعمیر نو میں حصہ لے رہے ہیں۔"

یہ تمام خدمات آخر انہیں کیوں نہیں دکھائی دیتیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ان کی آنکھوں پر حسد کا پردہ پڑ چکا ہے۔

حسد کی آگ

یہ لوگ حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ انہیں یہ خدمات ہی نہیں دکھائی دیتیں۔ ایسے لوگ کبھی بھی مقام و منصب نہیں پا سکتے۔ **الحسود لا یسود** "حاسد شخص بزرگی نہیں حاصل کر سکتا۔" یہ ارشاد حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے منسوب ہے۔ یہاں تک کہ بعض احادیث میں ہے کہ حاسد جنت کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکتا۔ حسد کرنے والے آدمی اور جنت کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں۔ کسی کا دل اگر حسد سے پر ہو تو وہ جنت میں کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ جب وہ دیکھے گا کہ اس کا مخالف جنت میں بلند مقام پر پہنچ گیا ہے تو خود جنت اس کے لئے ایک قید خانہ بن جائے گی اور وہ اس میں خوش نہیں رہ پائے گا۔

آج بھی حسد کرنے والے رات دن حکومت اسلامی کی تباہی کے منتظر ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس حکومت کی بنیادیں روز بروز مضبوط ہو رہی ہیں' مجاہدین محاذ جنگ پر جان کی بازی لگا رہے ہیں' اور نصرت الٰہی سے کامیاب ہو رہے ہیں تو ان کی حسد کی آگ اور بھڑک جاتی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ آپ لوگ دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بھی محاذ جنگ پر نئی فتح و کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ایسے حسد کرنے والے افراد ملک کے اندر فتنہ و فساد کرنے لگتے ہیں۔

نماز جمعہ کا فائدہ

ہفتے بھر علمائے کرام کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کر کے مخالفین یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ اس کا شکار ہو چکے ہیں۔ پھر جب جمعے کا دن آتا ہے اور لمبی لمبی قطاروں میں لاکھوں افراد نماز جمعہ ادا کرنے جاتے ہیں تو ان کا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ سچ ہے نماز جمعہ ایک ایسا تیر ہے جو ان حسد کرنے والوں کی آنکھوں میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور اب ان کی تمام تر کوششیں انہی کے نقصان میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

یکم مئی مزدوروں کا دن تھا اس کے خلاف غلط سلط پروپیگنڈہ کیا گیا۔ محنت

کشوں کو ورغلایا گیا۔ مزدوروں کے نام نہاد حقوق کی باتیں کر کے اور جھوٹے وعدے کر کے انہیں اسلامی حکومت سے مایوس کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یوم مزدور کے موقعے پر ہم نے دیکھ لیا کہ محنت کشوں کا یہ طبقہ نام نہاد نعروں اور جھوٹے دعوؤں کے فریب میں نہیں آیا۔ محنت کش عوام نے پورے ملک میں جلسے اور جلوس کا اہتمام کیا اور اس طرح عدل و انصاف پر مبنی اسلامی حکومت کی حمایت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

مخالفین جو چاہیں کریں لیکن انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ فیصلے خدا کی بارگاہ میں محفوظ اور معین ہیں۔ وہ لوگ فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شورش کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں۔ کیا انہیں نہیں معلوم کہ **کلما اوقدوا نارا للحرب اطفاها الله** (سورہ مائدہ ۵: آیت ۶۴) "جب یہ لوگ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔"

فتنہ و فساد پھیلانے والے روز بروز رُسوا ہوتے جا رہے ہیں۔ متعدد مُنافق گروہوں کے بارے میں انکشاف ہوا ہے کہ ان کے بہت سے اہم کارکنوں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ یہ خبریں اخباروں میں بھی چھپ چکی ہیں۔

بارہواں درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تکبُّر

اے قابل قدر جوانو! دینی طالب علمو! اور کالج کے طالب علمو! آپ لوگ جس شعبے میں بھی کوشاں ہیں اور لگن سے کام کر رہے ہیں میں آپ کی توجہ ایک اہم اور خطرناک امر کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اس اہم اور خطرناک امر سے غافل رہے تو آپ کی تمام کاوشیں رائیگاں ہو کر رہ جائیں گی۔ اور وہ خطرناک امر جس سے تمام زحمات بے سود ہو جاتی ہیں تکبر میں مبتلا ہو جانا ہے۔ یوں تو تکبر ایسی خطرناک شئے ہے جس کی زد میں معاشرے کے تمام طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ لیکن اکثر اس خطرناک حملے کا شکار خود اہل علم ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ علمی گفتگو جو ہم کر رہے ہیں ممکن ہے تکبر کی وجہ سے ہماری تباہی و بربادی کا سبب بن جائے۔ جیسا کہ ابلیس تباہ و برباد ہوا تھا۔ روایتیں بتلاتی ہیں کہ کائنات میں سب سے پہلا گناہ ابلیس نے کیا تھا' اور وہ گناہ تکبر ہی تھا۔ تکبر کی وجہ سے وہ رحمت الٰہی سے دور ہوا اور بارگاہ الٰہی سے ذلیل کر کے نکال دیا گیا۔

سب سے پہلے تکبر کے معنیٰ' بعد میں اس کے نقصانات اور پھر خاص طور پر اہل عِلم تکبر میں کیوں مبتلا ہوتے ہیں' بیان کروں گا۔

تکبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو شان و شوکت اور بعض خاص صلاحیتوں کا مالک سمجھ بیٹھے اور خود کو دوسروں سے بے نیاز سمجھنے لگے۔ خود چند علمی اصطلاحات اور مسئلے مسائل کی وضاحت کو یاد کر لینے کے بعد اپنے آپ کو بڑا آدمی خیال کرنے لگے۔ یا مثال کے طور پر اگر قسمت سے اسے زیادہ مال و دولت حاصل ہو گیا ہے تو دوسروں کو اپنا ملازم اور خود کو ان کا آقا تصور کرنے لگے۔ علم کے بعد انسان مقام اور منصب کی وجہ سے بھی اکثر تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب

اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے اور حکومت مل جاتی ہے تو خود کو بڑا سمجھ لیتا ہے۔

جہل مرکب

تکبر کی وجہ سے آدمی جہل مرکب کا شکار ہو جاتا ہے۔ جہل کی وجہ سے خود اپنی حقیقت سے بے بہرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ خدا کی عبادت سے انکار کر بیٹھتا ہے۔ جہل سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو حقیقت میں نہ سمجھا جا سکے بلکہ اپنے ذہنی خیالات ہی کو حقیقت سمجھ لیا جائے۔ مثال کے طور پر حضرت آدمؑ سے حضرت خاتمؐ تک اور ابتدائے موجودات سے آخر موجودات تک ساری کی ساری کائنات خدا کی محتاج ہے۔ تمام کائنات کا محتاج ہونا بالکل واضح سی بات ہے۔ کائنات کی ہر شئے اپنے وجود کی بقاء کے لئے اپنی صفتوں اور صلاحیتوں کے اظہار کی خاطر اور اپنی موجودہ کارکردگی کو برقرار رکھنے کے لئے خداوند متعال کی محتاج ہے۔ آپ کائنات کی کسی بھی چیز کا تصور کیجئے ہر چیز آپ کو خدا کی محتاج نظر آئے گی۔ کوئی بھی شئے نہ تو از خود وجود میں آئی ہے اور نہ ہی باقی رہ سکتی ہے۔

انسان کو سوچنا چاہئے اور غور کرنا چاہئے کہ کیا اس کا وجود اس کی اپنی ذات کی وجہ سے ہے؟ کیا اس نے اپنے آپ کو پیدا کیا ہے؟! حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس کی خواہش کے بغیر زندگی عطا کردی گئی۔ اور وہ زندگی گزار رہا ہے۔ اگر وہ مرنا بھی چاہے تو جب تک خدا کو منظور نہ ہو نہیں مر سکتا۔ نہ زندہ رہنا انسان کے اختیار میں ہے اور نہ ہی مرنا۔ زہر کھا کر مر جانا اس وقت ممکن ہے جب خدا کو بھی منظور ہو۔ جب خدا کو منظور ہو گا تب ہی آدمی زہر کھا کر مر سکتا ہے ورنہ زہر بھی اس پر اثر نہیں کرے گا۔

خودکشی کی دوہری کوشش

کچھ عرصہ پہلے ایک رسالے میں یہ واقعہ میری نظر سے گزرا کہ نیویارک میں ایک شخص نے کئی منزلہ عمارت بنانے کے سلسلے میں بینک سے لاکھوں ڈالر قرض

لیا۔ اسے بینک نے اس شرط پر قرضہ دیا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ سود کے ساتھ واپس لوٹا دے گا۔ قرض کی رقم سے کئی منزلہ عمارت مکمل نہ ہو سکی اس کے پاس نہ تو اتنی رقم موجود تھی کہ وہ عمارت کو مکمل کرتا اور نہ ہی اس سلسلے میں اسے کہیں اور سے کوئی قرض مل سکا۔ بینک کا قرض اس کے ذہن پر بوجھ بن چکا تھا۔ وہ روز بروز اسی بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔ کوئی شخص اس نامکمل عمارت کو کرایہ پر لینے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ آخر کار تنگ آکر اس نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔

خودکشی کرنے کے لئے اپنی عمارت کی چھت پر چڑھ گیا ساتھ ہی ساتھ اس نے زہر بھی کھا لیا تھا تاکہ بچنے کا کوئی امکان نہ رہے۔ اونچی عمارت سے اس نے خود کو سر کے بل گرا دیا۔ لیکن زیر تعمیر عمارت میں لگائے ہوئے ایک تختے میں وہ پھنس کر رہ گیا۔ چونکہ اس کا سر نیچے تھا لہٰذا سارا زہر اس کے منہ سے نکل گیا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ خودکشی کی دوہری کوشش بھی ناکام ہو کر رہ گئی! جب تک خدا نہ چاہے تو انسان خواہ کتنی ہی کوششیں کر لے اسے موت نہیں آسکتی۔ مرنا بھی مرضی معبود کے بغیر اس کے اختیار میں نہیں ہے! اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

نیازمندی

یہیں سے ہم اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا وجود، ہماری بقاء، ہماری زندگی اور موت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ **لا یملک لنفسه نفعا ولا ضرا ولا موتا ولا حیاۃ ولا نشورا** "انسان خود کو فائدہ اور نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہے۔ وہ نہ تو خود کو زندگی عطا کر سکتا ہے اور نہ ہی موت دے سکتا ہے۔"

جس طرح دنیا میں آنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے اسی طرح اس دنیا سے جانا بھی ہمارے بس میں نہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر ہمیں اس دنیا میں لایا گیا۔ ہماری دیکھ بھال اور حفاظت کی گئی پھر ہمیں واپس بلا لیا جائے گا۔ **ھو الغنی** "وہی خدا تو بے نیاز ہے"۔ جی ہاں، خدا کے علاوہ پوری کائنات نیازمند ہے۔ تمام موجودات

عالم اسی کی طرف محتاج ہے۔ اپنے وجود' اپنی بقاء اور اپنے افعال کو انجام دینے کے سلسلے میں انسان خدا ہی کی طرف محتاج ہے۔ آپ کوئی سا بھی کام کرنا چاہیں اس کے لئے قدرت و طاقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ طاقت و قدرت کیا آپ خود اپنے اندر پیدا کرتے ہیں؟!

بہت سے ایسے کام ہیں جو انتہائی آسان معلوم ہوتے ہیں لیکن آدمی اسے نہیں کرپاتا۔ اور اسی طرح بہت سے ایسے کام ہیں جو انتہائی مشکل معلوم ہوتے ہیں لیکن آدمی اسے انجام دینے پر قادر ہو جاتا ہے۔ **لہٰذا** یہ نہ کہیں کہ "میں اس کام کو کروں گا۔" کیا آپ اس کام کو کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟ آپ کا وجود میں آنا جب خود اپنی طرف سے نہیں ہے تو کام کرنے کی طاقت اور قدرت کہاں سے آپ کی اپنی ہو سکتی ہے۔ تمام طاقت و قوت کا سرچشمہ ذات الٰہی ہے۔ **لاحول ولا قوۃ الا باللہ**

کوئی بھی شخص خدا سے بے نیاز نہیں

انسان کا علم خواہ کتنا ہی وسیع ہو جائے وہ خدا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مجتہد' ڈاکٹر یا انجینئر بن جانا انسان کو خدا سے بے نیاز نہیں بنا سکتا۔ وہ پہلے ہی کی طرح اب بھی خدا کا محتاج ہے۔ محتاج ہونا انسان سے کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتا۔ میرے اس جملے کو ہمیشہ یاد رکھیئے کہ "جب تک آپ انسان ہیں محتاج ہیں۔"

علم **حافظے** میں ہوتا ہے۔ **حافظے** کی حفاظت کون کرتا ہے؟ کوئی پچاس سال پہلے کی بات ہے حوزہ علمیہ میں "مطول" کے ایک استاد ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ سو کر اٹھے تو سورہ حمد تک بھول چکے تھے۔ وہ نسیان کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ جب کلاس میں پہنچے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج تک انہوں نے کچھ پڑھا ہی نہیں ہے۔ وہ تو بسم اللہ تک بھلا چکے تھے!

ہماری ان معلومات کو حافظہ' ٹیپ ریکارڈ کی طرح محفوظ رکھتا ہے۔ حافظہ ایک ایسی معنوی قوت کا نام ہے جس میں لامحدود معلومات نقش ہو جاتی ہیں۔ یہ

معلومات کسی مادی شئے میں محفوظ نہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی کلاس میں جو الف باء (ا۔ب) پڑھایا گیا تھا وہ اب بھی **حافظے** میں محفوظ ہے۔ اگر اس **حافظے** کی نعمت کو چھین لیا جائے تو آپ الف باء تک بھول جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ عالم بھی اپنے علم کا اظہار کرنے کے سلسلے میں خدا کا محتاج ہے۔ کوئی بھی شخص خدا سے بے نیاز نہیں ہے۔

ایک حکیم کا واقعہ

علاج کرتے وقت حکیم کا حافظہ اور ذہن اگر صحیح طور پر کام کرے تب تو وہ اپنی صلاحیتوں سے صحیح فائدہ اٹھا سکتا ہے اور صحیح دوا تجویز کر سکتا ہے۔ لیکن اگر خدا نہ چاہے تو پھر وہ کیسے صحیح علاج کر سکے گا!

تیس سال یا اس سے بھی کچھ پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک حکیم کا بیٹا بخار میں مبتلا ہو گیا۔ حکیم نے ملیریا سمجھ کر اسے دوائیں دی۔ دواؤں نے نہ صرف یہ کہ مریض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ الٹا نقصان پہنچا دیا۔ کیوں کہ اسے ملیریا نہیں بلکہ ٹائیفائڈ تھا۔ چنانچہ چند روز ہی میں اس کا جوان بیٹا مر گیا۔ باپ کی حکمت جوان بیٹے کے کوئی کام نہ آسکی۔ وہ نہ تو مرض کو پہچان سکا اور نہ ہی صحیح دوا دے سکا۔ آپ نے غور فرمایا کہ طبیب نے اپنے بیٹے کو کس طرح پوری کوشش اور حکمت کے ساتھ دوا دی لیکن پھر بھی وہ اسے نہیں بچا سکا۔ دوا اور اس کا اثر سب کچھ خدا ہی کے ہاتھ میں تو ہے۔

ہمارے ایک ڈاکٹر جن کا انتقال ابھی ہوا ہے' بڑے متقی آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا: "بعض اوقات مجھے پورا یقین ہوتا ہے کہ دوا مفید ثابت ہو گی لیکن بعد میں میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا! اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں محض یہ سوچ کر کہ شاید اس دوا سے مریض کو فائدہ ہو جائے گا' دوا دے دیتا ہوں اور پھر یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مریض اس دوا سے مکمل صحت یاب ہو چکا ہے۔" **لہٰذا** معلوم ہوا کہ دوا کی تاثیر بھی خدا

کی جانب سے ہوا کرتی ہے۔

ڈاکٹر بھی مجتہد ہی کی طرح تو ہے۔ جس طرح مجتہد اپنے علم سے روحانی بیماریوں کا علاج کرتا ہے اسی طرح ڈاکٹر اپنے علم سے جسمانی بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔ کسی کو اپنے علم کی وجہ سے تکبر میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ انسان جب کچھ پڑھ لکھ لیتا ہے تو خود کو بے نیاز سمجھنے لگتا ہے۔ یہ اس کا خیال خام ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ **کلا ان الانسان لیطغی ان راہ استغنی** (سورۂ علق ۹۶: آیت ۶ اور ۷) "یاد رکھو! کہ جب انسان اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے تو وہ سرکش اور نافرمان ہو جاتا ہے۔"

علماء کی شان

مجتہد ہو یا ڈاکٹر، انجینئر ہو یا ماسٹر سب کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ بڑے انسان نہیں ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے تو سب برابر ہی ہیں۔ ایک کروڑ پتی آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ وہ غریب آدمی سے بڑا ہے اور بے نیاز ہے! ان لاکھوں روپوں نے کیا تجھے بے نیاز کر دیا ہے؟! اگر تجھے سرطان کا مرض ہو جائے تو کیا روپے تجھے اس سے نجات دلا سکتے ہیں؟ محمد رضا شاہ پہلوی نے جو رقم باہر بھیجی تھی اس سے اسے کیا فائدہ ہوا؟

میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ یہ باتیں اور نصیحتیں مجتہدین کرام کے لئے بھی ہیں۔ مجتہد کو چاہئے کہ وہ خود پر ناز نہ کرے اور دوسروں کو حقیر نہ سمجھے۔ لوگوں سے عزت و احترام کا طالب نہ رہے۔ البتہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ ہر صاحب علم کی عزت کریں۔ خاص طور پر عالم دین کی عزت کے سلسلے میں مفصل احادیث موجود ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ عالم کی عزت، رسول خداؐ کی عزت ہے۔ اور عالم دین کی توہین، رسول خداؐ کی توہین ہے۔

تیرہواں درس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تکبّر کا علاج

سب سے پہلے تکبر کے معنی، اس کے بعد تکبر کے اسباب اور پھر اس کے گناہ کبیرہ ہونے کے بارے میں جاننا چاہئے۔

تکبر ایک ایسی حالت کا نام ہے جو انسان کے نفس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت جب انسان میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ خود کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور ایک مصنوعی شان و شوکت کا قائل ہو جاتا ہے۔ خود اپنی حقیقت اس کی اپنی نگاہوں سے محو ہو جاتی ہے۔ تمام انسان درحقیقت محتاج ہیں ان کا بدن خاک کے علاوہ اور کچھ بھی تو نہیں۔ ان کا جسم اسی مٹی سے بنا ہے اور بعد میں پھر مٹی ہی تو ہو جائے گا۔ ان کی روح بھی درجہ کمال تک پہنچنے میں محتاج ہے۔ تمام مخلوقات عالم کی عظمت و بزرگی ان کی اپنی ذاتی نہیں ہیں اور نہ ہی وہ خود اپنے وجود کو باقی رکھ سکتے ہیں۔ صحت و سلامتی ہو یا بیماری، مال و دولت ہو یا تنگ دستی کچھ بھی تو انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ جب تک خدا توفیق نہ دے انسان اپنی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

عباد مخلوقون اقتدارا مربوبون مقبوضون احتضارا "تم لوگ اللہ کے خلق کردہ ایسے بندے ہو کہ جنہیں خدا نے اپنی طاقت و قدرت سے خلق فرمایا ہے۔ تم لوگ ایسے بندے ہو کہ جن کی تربیت اور دیکھ بھال خدا ہی نے قوت اور غلبہ کے ساتھ کی ہے۔ اور تم لوگ ایسے بندے ہو کہ جنہیں خدا جب چاہے گا موت دے کر اپنی بارگاہ میں واپس بلا لے گا۔"

آپ نے غور فرمایا کہ اس دنیا میں آنا اپنے وجود کو برقرار رکھنا اور یہاں سے

واپس لوٹ جانا کچھ بھی تو انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ایک اور مقام پر حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں: **عجبت لابن دم اولہ نطفہ و خرہ جیفتہ وھو قائم بینھما و بماء للغائط ثم تکبر** (سفینتہ البحار جلد ۲، صفحہ ۴۶۰)

"مجھے بنی آدم پر حیرت ہے کہ وہ کیوں تکبر کرتا ہے جبکہ اس کی ابتداء ایک نجس قطرہ ہے اور اس کی انتہائی نجس مردار ہے۔ وہ ان دونوں نجاستوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اس کی آنتوں میں کیا ہے اور جسم میں کیا بھرا ہوا ہے۔"

تکبر گناہوں کا سبب ہے

بہت سے گناہ انسان تکبر کی وجہ سے کرتا ہے۔ اگر انسان میں یہ بری صفت پیدا ہو جائے اور اس کی اصلاح نہ ہو تو وہ کسی بھی حق بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ حق تسلیم نہیں کرتا بلکہ خود اپنے آپ ہی کو حق سمجھنے لگتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں بس وہی صحیح اور درست ہے! کسی اور کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے!" ایسا آدمی کبھی بھی انبیاء کرامؑ اور ائمہ عظام کا اطاعت گزار نہیں ہو سکتا۔ ایسے شخص کی مثال تو ان لوگوں کی طرح ہے جنہوں نے امیر المومنینؑ سے تکبر کیا اور ان کی بیعت نہ کی یا بیعت کرنے کے بعد بھی نافرمانی کی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ تکبر کیوں پیدا ہوتا ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔

دولت پر گھمنڈ

تکبر پیدا ہونے کا ایک سبب مال ہے۔ جب مال و دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو اکثر و بیشتر انسان تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ تکبر جہل کی پیداوار ہے۔ ورنہ اگر آدمی صحیح سوجھ بوجھ کا مالک ہو اور عقل و دانش سے کام لے تو وہ اس حقیقت کو با آسانی سمجھ لے گا کہ مال انسان میں کسی چیز کا کوئی اضافہ نہیں کرتا ہے۔ کسی شخص کے پاس کروڑوں روپے ہوں اور دوسرے کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو آخر انسان ہونے کے اعتبار سے ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن جب مال و دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو آدمی خود کو دوسرے غریب لوگوں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے اور اس طرح وہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

آپ نے مجھ سے سنا ہو گا ایک مرتبہ میں نے یہ واقعہ پڑھا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں ایک دولت مند آدمی بیٹھا ہوا تھا اسی اثناء میں ایک غریب مومن بھی آ گیا۔ آنے والا بندہ مومن اسلامی طریقے کے مطابق اپنے دولت مند بھائی کے پاس جگہ خالی دیکھ کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر دولت مند نے اپنا لباس سمیٹ لیا۔ اللہ کے رسولؐ نے اس سے فرمایا کہ آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟

وہ مال دار شخص شرمندہ ہو گیا۔ اس نے حضور اکرمؐ سے کہا: "مجھ میں کوئی ایسی خرابی موجود ہے جو مجھے اس طرح کے غیر اخلاقی اور ناروا کاموں کی طرف ابھارتی ہے۔ یعنی میرا نفس مجھے غرور و تکبر کی طرف لے جاتا ہے۔ میں اپنی اس غلطی پر پشیمان ہوں۔ اب اس کا ازالہ اس طرح کر سکتا ہوں کہ اپنے اس غریب مومن بھائی کو اپنی کل پونجی کا نصف دے دوں۔"

رسول خداؐ نے اس غریب مومن سے دریافت فرمایا کہ کیا تم اس کی نصف دولت کو قبول کرتے ہو؟ اس بندہ مومن نے جواب دیا: "اے اللہ کے رسولؐ میں اس کی دولت کو قبول نہیں کروں گا! کیوں مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں میں بھی اس کی طرح غریب اور مفلس لوگوں سے تکبر نہ کرنے لگوں!!"

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مال و دولت میں اضافے کے ساتھ ساتھ جہل میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اس میں کوئی بڑائی پیدا ہو گئی ہے اور وہ دوسروں کو متکبرانہ انداز میں دیکھنے لگتا ہے۔

علم پر گھمنڈ

علم پر گھمنڈ مال سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ کوئی آدمی یونیورسٹی یا مدرسے میں جائے وہاں سے کچھ علمی اصلاحات یاد کر کے باہر نکلے اور خود کو بڑا آدمی سمجھنے لگے اور دوسروں کو حقیر نگاہوں سے دیکھنے لگے تو ایسا عمل مال و دولت پر گھمنڈ کرنے سے زیادہ مضر اور نقصان دہ ہے۔ اگر کوئی دینی علوم مثلاً فقہ و اصول کی کچھ باتیں سیکھ لے اور اس کی حالت یہ ہو کہ خود کو دانشور، عالم دین اور انبیاءؑ کا وارث سمجھ بیٹھے اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو کر لوگوں سے کہے کہ میری اطاعت کرو، تو ایسے دینی طالب علم کا تکبر میں مبتلا ہو جانا انتہائی خطرناک ہے۔ دوسرے لوگ چونکہ مادی چیزوں کے متعلق تکبر کرتے ہیں لہٰذا ان کا پول لوگوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔ لیکن دینی طالب علم مقام و مرتبے اور لوگوں کے دلوں میں حکومت کرنا چاہتا ہے اس لئے ایسا شخص جب تکبر میں مبتلا ہو جائے تو اس کا نقصان دوسرے لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ تکبر میں مبتلا علم دین رکھنے والا چند کلمات یاد کر کے یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ فلاں شخص نے مجھ سے کم پڑھا ہے لہٰذا میری ایک جداگانہ امتیازی حیثیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر علم و دانش میں اضافے کے ساتھ ساتھ ایمان و معرفت میں اضافہ نہیں ہوا ہے تو اس عالم میں اور ایک ان پڑھ آدمی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ عوام جنہیں اپنی ناخواندگی کا احساس ہے اور اسی وجہ سے ان میں عجز و انکساری ہے، اس عالم سے بہتر ہیں جو پڑھ کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو چکا ہے۔

مقام و مرتبہ تو ایمان و عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم کو اہمیت دی گئی ہے جس سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان قوی ہو۔ اور قلب ایسا منور ہو جائے جس سے اس میں خضوع و خشوع اور انکساری پیدا ہو۔

کوئی بھی شخص خواہ کتنا ہی بڑا عالم و دانشور کیوں نہ ہو اس کا علم امامؑ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک عقلمند شخص اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ علم امامؑ ایک سمندر ہے تو اس کا علم ایک قطرہ۔ غور فرمائیے کہ امامؑ جو معدن علم ہیں، تمام علم و حکمت کا خزانہ ہیں خود اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

صحیفہ سجادیہ میں دعائے عرفہ موجود ہے۔ اس دعا میں ایک مقام پر حضرت زین العابدین علیہ السلام، خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں: **و انا بعد اقل الا قلین بل اقل من الذرۃ** "میں تو سب سے چھوٹا ہوں بلکہ ایک ذرے سے بھی چھوٹا۔" امامؑ فرماتے ہیں کہ میں خدا کی بارگاہ میں سب سے کمتر اور حقیر ہوں یہ جاننے اور سننے کے باوجود اب کوئی اپنے آپ کو عالم سمجھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ میں فلاں سے بڑا ہوں! خدا کے ہاں بزرگی کا معیار تقویٰ ہے۔

ایک دینی طالب علم کو یہ جان لینا چاہئے کہ جس طرح پہلے خدا کی مخلوق تھا آج بھی ہے۔ وہ آج بھی اسی طرح خدا کا محتاج ہے جس طرح طالب علمی کے زمانے سے پہلے تھا۔ خود کو دوسروں سے بڑا نہ سمجھے یہ نہ کہے دوسرے عام لوگ ہیں اور میں ایک خاص عالم ہوں۔ یہ خاص ہونا کیسا؟ یعنی کم تعداد میں ہونا (علماء کا گروہ)۔ عام ہونا کیسا؟ یعنی زیادہ تعداد میں ہونا (لوگ)۔ تو کیا کم تعداد والے گروہ کو بڑی تعداد والوں سے اکڑنا چاہئے! ان پر بڑائی جتلانا چاہئے! محض اس لئے کہ وہ چند علمی اصطلاحات جانتے ہیں!

میں کیا چیز ہوں

جب بھی انسان کے پاس حقیقی علم آجاتا ہے تو اس کی سوچ کا انداز بدل جاتا ہے اور وہ اس حد تک سوچنے لگتا ہے کہ ہو سکتا ہے میرا مقلِّد تو جنّت میں جائے اور میں جہنم میں دھکیل دیا جاؤں۔ اسی لئے ایسے عالم دین میں تواضع اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خود کو سب سے معمولی سمجھنے لگتا ہے۔

ابھی چند ہی روز پہلے کی بات ہے کہ امام خمینی نے محاذ جنگ پر جانے والے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "آپ لوگوں کے سامنے میں شرم محسوس کر رہا ہوں!" اس جملے سے اتنے بڑے مجتہد کی قلبی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس عظیم الشان رہبر کی نگاہوں میں راہ خدا میں جہاد کتنا اہم ہے۔ لہٰذا امام خمینی خود کو اس جان فشانی کے مقابلے میں حقیر بتا رہے ہیں۔

علم و دانش اگر تواضع اور انکساری کے ساتھ ہو تو ٹھیک ہے ورنہ شیطان بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ لیکن تکبر کی وجہ سے ذلیل و رسوا ہو گیا۔ بلعم باعور ایک ایسا مشہور و معروف عالم تھا جس کی دعا قبول ہوا کرتی تھی۔ لیکن جب لوگوں نے اس سے کہا کہ جس طرح بنی اسرائیل کے پیشوا موسیٰؑ ہیں اسی طرح تم عمالقہ کے پیشوا ہو! وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں آ گیا۔ خود کو بڑا سمجھ بیٹھا اور بد قسمتی اس کا مقدر بن گئی۔

افسوس اس علم دین رکھنے والے پر جو تکبر میں مبتلا ہو جائے! اور اس یونیورسٹی کے طلب پر جو خود کو بڑا سمجھ کر تکبر کا شکار ہو جائے!

شہرت پر گھمنڈ

تکبر پیدا ہو جانے کی ایک وجہ شہرت بھی ہے۔ اگر انسان کسی مقام و منصب کی وجہ سے مشہور ہو جائے تو اس پر بھی گھمنڈ کرنے لگتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انسان کسی شہرت یافتہ خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بھی گھمنڈ کرنے لگتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ مثلاً فلاں نامی گرامی شخص کا بیٹا ہے لہٰذا اب دوسرے اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے وہ اس احساس برتری کی وجہ سے دوسرے کسی خاندان میں شادی کرنے سے بھی انکار کر دیتا ہے!

کبھی کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سید ہونے کی وجہ سے انسان غرور و

و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے! سید یعنی وہ شخص جس کا سلسلہ نسب آئمہ طاہرینؑ اور خاتم الانبیاءؐ سے ملتا ہو۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ خود خاتم الانبیاءؐ کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ حضورؐ ہمیشہ عجز و انکساری اور تواضع رکھتے ہیں خود دوسروں کو سلام کرنے میں پہل فرماتے ہیں۔ یہاں تک کہ بچوں کو بھی سلام کرتے ہیں۔ اور ایک یہ سید ہے جس نے رسول خداؐ اور ان کے خاندان سے منسوب ہونے کی وجہ سے سیادت کا شرف حاصل کیا ہے، لیکن خود یہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اسے سلام کریں! اے شخص تو نے جن سے منسوب ہو کر سید ہونے کی سند حاصل کی ہے ان کی تواضع اور انکساری بھی تو دیکھ! اور اگر فضیلت حاصل کرنا ہے تو ان کی سیرت و کردار اپنا کر فضیلت حاصل کر۔

اقتدار پر گھمنڈ

منصب و اقتدار اور اپنے چاہنے والوں پر گھمنڈ انتہائی خطرناک ہے اور ایسی صورت میں تباہی و بربادی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اقتدار حاصل کرنے کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس سے نجات حاصل کرنا انتہائی دشوار ہے۔ اس میں ایک ایسا بڑائی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ویسے تو تکبر میں مبتلا اور دوسرے لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن اقتدار پر گھمنڈ کرنے والے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اقتدار و حکومت پر تکبر کرنے والا اور اس کی ہوس رکھنے والا آخر کار ہلاک ہو جاتا ہے!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "اصول کافی" کی ایک حدیث بیان کروں۔ رسول خداؐ کا ارشاد ہے: **ما اضر بقلوب ارجال من خفق النعال** "اپنے پیچھے لوگوں کو چلانے اور ان پر حاکم رہنے کے جذبے سے بڑھ کر کوئی اور چیز آدمی کے دل کو تباہ و برباد نہیں کرتی ہے۔"

اگر کچھ لوگ کسی شخص کی بات ماننے لگتے ہیں اور اس کے تابعدار ہو جاتے

ہیں تو بہت جلد غرور و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے کہ وہ حق کے مقابلے میں آ جاتا ہے۔ اسے یہ ہرگز منظور نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی پیروکار کسی دوسرے گروپ میں شامل ہو جائے۔ وہ تو بس یہ کہتا ہے کہ دوسروں کو چاہئے کہ وہ میری اطاعت کریں۔ حدیث میں اقتدار کی ہوس رکھنے والے اور اس پر تکبر کرنے والے کو ہلاک ہو جانے والا اور ملعون قرار دیا گیا ہے۔ **من طلب الریاسته هلک** "جو شخص اقتدار کی ہوس رکھے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔" **ملعون من براس** "جس نے بھی اقتدار طلب کیا وہ ملعون ہے۔"

(سفینتہ البحار جلدا، صفحہ ۴۹۲)

اقتدار کی ہوس کرنے والا اور اس پر گھمنڈ کرنے والا اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ بس وہ حق و باطل کا معیار اپنی ذات کو سمجھنے لگتا ہے! نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کی چاہت کا دم بھرنے والے خواہ کتنے ہی برے ہوں وہ ان کو اہمیت دیتا ہے ان کے عیبوں کو چھپاتا ہے۔ اور ان کی حمایت کرتا ہے! اور انہیں اچھا قرار دیتا ہے! اس کے مقابلے میں جو اس کے حامی نہیں ہوتے وہ ان کو برا قرار دیتا ہے اگرچہ کہ وہ بہترین سیرت و کردار کے مالک ہوں۔ ان کی اچھائیاں اسے نظر نہیں آتیں اقتدار کی ہوس میں اندھا ہو جانے کی وجہ سے حق اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

بالائق شخص

شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے کتاب "رسائل" میں خبر واحد کی حجیت پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے ایک تفصیلی حدیث نقل کی ہے۔ اس حدیث میں امامؑ نے ایسے برے علما کی پہچان بتائی ہے جن کی وجہ سے مسلمانوں کو انتہائی نقصان پہنچ سکتا ہے امام حسن عسکریؑ فرماتے ہیں کہ برے عالم کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ تعصبی ہوگا۔ جو اس کی بات مانے گا اسے وہ تعصبی عالم صحیح اور درست قرار دے گا۔ اپنے چاہنے والوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے گا خواہ وہ فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس وہ تعصبی عالم جو لوگ اس کی بات نہیں مانتے اسے غلط قرار دے گا۔ خواہ وہ نیک اور متقی ہی کیوں نہ ہوں۔

کوئی بھی شخص جب اپنے شعبے میں ماہر ہو جاتا ہے اور اسے مقام اور منصب حاصل ہو جاتا ہے تو اس میں اس بیماری کے پیدا ہو جانے کا احتمال رہتا ہے حصول اقتدار کی بیماری اگر پیدا ہو جائے تو اس سے نجات کی فکر کرنی چاہیے۔ عقلمند انسان مقام و منصب سے اور حصول اقتدار سے دوری اختیار کرتا ہے۔ جب تک مجبور نہ ہو وہ اسے قبول نہیں کرتا۔

اقتدار خدمت کے لئے ہو

کہیں یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ اسلام حکومت و اقتدار ہی کا مخالف ہے۔ اسلام میں حاکم کا وجود ضروری ہے۔ قاضی کی ضرورت ہے، صوبے کا گورنر چاہیے، شہر کا میئر چاہیے، مقصد یہ ہے کہ اقتدار کی ہوس نہ ہو بلکہ اگر ضروری ہو جائے تو اقتدار خدمت کے لئے ہو۔ آدمی یہ نہ چاہئے کہ وہ صوبے کا گورنر بنے بلکہ یہ چاہیے کہ وہ صوبے کے نظم و نسق کو چلانے والا اور مسلمانوں کی خدمت کرنے والا بنے خطرہ اس شخص کے لئے ہے جو اقتدار کی ہوس رکھتا ہے۔

حضرت داؤدؑ کی حکومت

تکبر کا علاج تواضع اور انکساری سے کرنا چاہیے۔ حضرت داؤدؑ پیغمبر ہیں ملک کے حاکم اور بادشاہ بھی ہیں۔ کتاب **من لا یحضرہ الفقیہ** میں ہے کہ آواز آئی: "اے داؤدؑ تم بہت اچھے بندے ہو لیکن بیت المال سے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہو۔" یہ آواز سن کر جناب داؤدؑ خداوند متعال کی بارگاہ میں چالیس شب و روز روتے اور گڑگڑاتے رہے۔ یہاں تک کہ پروردگار عالم نے لوہا ان کے لئے نرم کر دیا اور زرہ بافی کا ہنر عطا کر دیا۔ اب حضرت داؤدؑ زرہ بنایا کرتے تھے اور سے بیچ کر اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرتے تھے۔ روایت میں ہے کہ ایک زرہ

تین سو درھم کی بیچا کرتے تھے۔ اس میں سے سو درھم راہ خدا میں خرچ کرتے، سو درھم بیت المال میں ڈال دیتے تھے اور باقی سو درھم سے اپنا گزارا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت داوٴدؑ کے فرزند جناب سلیمانؑ کے بارے میں ملتا ہے کہ اگرچہ جن و انس، چرند و پرند اور جنگلی جانوروں پر تک آپ کی حکومت تھی لیکن پھر بھی ٹوکریاں بنا کر اپنی گزر اوقات کیا کرتے تھے۔

اگرچہ تھوڑا ہو

اس قسم کی اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص مقام و منصب حاصل کر لینے کے باوجود دوسرے عام لوگوں کی طرح کچھ نہ کماتا رہے تو وہ غرور و تکبر سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ خیال اس کے ذہن میں نہیں آتا کہ میں حاکم ہوں لوگوں کو چاہیے کہ وہ میرے سامنے ادب سے کھڑے رہیں اور میں عہدے پر فائز شخص ہوں مجھے محنت مزدوری کی کیا ضرورت ہے۔ تکبر سے نجات حاصل کرنے کے لئے کام کرنا چاہیے اگرچہ تھوڑا ہو۔

ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے جلیل القدر صحابی محمد بن مسلم کو حکم دیا کہ: "تم تھام میں کھجوریں رکھ کر مسجد کوفہ کے پاس فروخت کرو۔" امامؑ کے یہ صحابی اگرچہ کہ بڑے مشہور و معروف تھے لیکن حکم ملتے ہی انہوں نے اس پر عمل کیا۔ اس لئے کہ تکبر سے محفوظ رہنے کا یہ ایک اچھا طریقہ تھا۔ مقصد غرور و تکبر سے بچنا ہے خواہ یہ مقصد کھجور بیچنے سے ہی حاصل ہو۔

حکم چلاتے رہنا غلط ہے

حکم چلاتے رہنا بھی غلط ہے جب آدمی حکم دینے لگتا ہے تو اس سے بھی اس میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔

مرحوم مرزا محمد تقی شیرازی کے بارے میں بعض معتبر لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ

اپنے گھر میں بھی حکم دینے سے اجتناب فرماتے تھے۔ اپنے اہل خانہ سے یہ تک نہیں کہتے تھے کہ "کھانا لے آوٴ" یا "برتن اٹھا کر لے جاوٴ"۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ گھر والے رات کا کھانا پہنچانا بھول جاتے تھے اور یہ مرحوم بزرگ عالم دین صبح تک یوں ہی رہ جایا کرتے تھے لیکن حکم دے کر کھانا اپنے کمرے میں نہیں منگواتے تھے!

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ حکم دینا حرام ہے، حکم دینا حرام نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ واقعاً" مرد بنے تو نفس کی جائز اور نرم و نازک خواہشات پر بھی قابو حاصل کرنے کی کوشش کرے اس سلسلے میں بھی مشق کرے اور اپنے بیوی بچوں پر بھی حکم نہ چلائے۔

☆○☆○☆○☆

عباسؑ بک ایجنسی کی اردو مطبوعات

قرآن مجید مترجمہ مولانا فرمان علی صاحب
(قسم اوّل جلی حروف رنگین) ۱۴۰/=
صحیفۂ کاملہ (جلی حروف)
مترجمہ مولانا محمد ہارون صاحب زنگی پوری ۷۵/=
وظائف الابرار (جلی حروف) مولانا فرمان علی صاحب ۵۵/=
استعاذہ دست غیب شیرازی ۴۰/=
توبہ " " ۱۸/=
تربیت اولاد مولانا جان علی شاہ کاظمی ۲۵/=
اولین موذن اسلام حضرت بلال سعید عین آبادی ۵/=
جناب فضہ راحت حسین ناصری ۷/=
مجالس عظیم مولانا سید کلب عابد صاحب ۲۵/=
سیرت امیر المومنین (جلد اول) صفحات ۷۲۰ ۱۲۰/=
سیرت امیر المومنین (جلد دوم) صفحات ۳۶۸ ۷۵/=
حضرت عائشہ کی تاریخی حیثیت فروغ کاظمی ۴۵/=
الخلفاء (حصہ اول و دوم) " " ۱۰۰/=
تحفۃ الابرار ترجمہ جامع الاخبار شیخ صدوق علیہ الرحمہ ۵۰/=
تفسیر کربلا فروغ کاظمی ۷۰/=
عرفان امامت (حالات امام زمانہ) ظفر عباس کشمیری ۷۰/=
آل محمدؐ کا دیوانہ بہلول دانا سیدہ عابدہ نرجس ۲۰/=
درگاہ حضرت عباسؑ تاریخ کی روشنی میں
مرتبہ حسن لکھنوی ۲۵/=
البیان (تفسیر سورۂ حمد) سید ابوالقاسم الخوئی ۳۰/=
حیات القلوب (تین جلدیں) علامہ مجلسی علیہ الرحمہ
مکمل سیٹ ۵۰۰/=
آدم اور علیؑ سید محمود گیلانی (سابق اہل حدیث) ۸/=
ایلیا " " " " ۱۲/=
اہل ذکر ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی ۷۰/=
انتقام خونیں یا خروج مختار سید محمد علی انجای ۱۰/=
انسان معاصر اور قرآن علامہ طالب جوہری ۹۰/=
حقیقت دین (مجموعہ مجالس، کراچی) مولانا کلب صادق مجلد ۸۰/=
خاندان رسالت (مجموعہ مجالس، بمبئی) مولانا مرزا محمد اطہر ۸۰/=
اسلام کا نظام خانوادگی مولانا سعید اختر صاحب ۳۰/=

قرآن مجید مترجمہ مولانا فرمان علی صاحب
(قسم دوم جلی حروف سادہ) ۱۳۰/=
صرف ایک راستہ عبدالکریم مشتاق (پاکستان) ۷۰/=
حقائق القرآن امتیاز حیدر پرتاب گڑھی ۴۰/=
وظائف القرآن (آرٹ پیپر رنگین) ۳۵/=
علوم القرآن مولانا سید محمد ہارون صاحب ۳۰/=
قرآن اور سائنس مولانا سید کلب صادق صاحب ۴۰/=
قرآن اور جدید سائنس مورس بوکائی ۳۰/=
امامیہ نماز باتصویر ۲۵/=
اسلام اور جنسیات ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی ۳۰/=
کائناتِ روش مراثی باقر علی خاں روش لکھنوی ۲۰/=
اسلام اور عزاداری (مجموعہ مجالس کراچی)
طاہر جرولی صاحب ۲۵/=
منازل آخرہ (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)
شیخ عباس قمی علیہ الرحمہ ۳۰/=
اٹھو! خونِ حسینؑ کا انتقام لو سیدہ عابدہ نرجس ۳۵/=
مولا علیؑ کوثر نیازی (پاکستان) و سید کلب صادق صاحب ۴۰/=
خطبات حضرت زینبؑ علامہ ابن حسن نجفی ۲۰/=
گناہانِ کبیرہ (مکمل سیٹ دو جلدوں میں) دست غیب شیرازی ۳۰۰/=
قلبِ سلیم (اول دوم و سوم مکمل سیٹ ایک جلد میں) " " ۱۲۵/=
خطبات نماز جمعہ مولانا سید کلب صادق، مرتبہ سید علی عباس ۷۰/=
حیات بعد از موت الحاج امتیاز حیدر پرتاب گڑھی ۳۵/=
مجالس اجتہادی علامہ نصیر اجتہادی (پاکستان) ۴۵/=
معجزہ اور قرآن (مجموعہ مجالس) ضمیر اختر نقوی (پاکستان) ۱۰۰/=
بحار الانوار (جلد ۱۰) حالات امام حسینؑ و واقعات کربلا علامہ مجلسیؒ زیر طبع
تفسیر اسلام (ابتدائے آفرینش سے ظہورِ امام تک کے
مصدقہ و مکمل حالات) فروغ کاظمی ۲۵۰/=
فتنۂ وہابیت (وہابیت کی مفصل و مکمل تاریخ) " " ۷۰/=
الامام (بجواب المرتضیٰ) مولانا ادیب الہندی صاحب ۵۰/=
روحوں کا سفر آقائے سید حسن نجفی، قوچانی ۲۰/=
تعقیبات نماز (بڑی سائز) مع دعائے عہد وغیرہ ۲۵/=
زادِ آخرت (منتخب تعقیبات) ۱۰/=